الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کسی کے اوپر سب سے زیادہ کارگر ہتھیار
خود اس کا ضمیر ہے
اور یہ ہتھیار ہر شخص کے پاس ہر وقت
موجود رہتا ہے

اگست ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۹

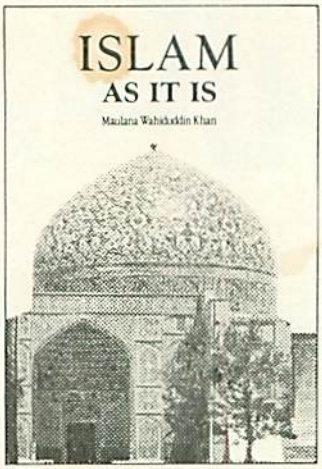

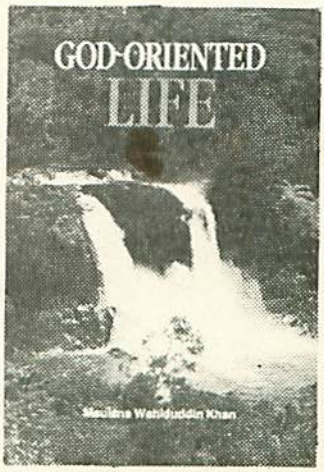

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

اگست ۱۹۹۲ء شمارہ ۱۸۹

	صفحہ		صفحہ
نوعیت حیات	۴	دین کے نام پر دنیا	۱۹
صرف ایک بار	۵	بدلہ لینا	۲۰
ہدایت وضلالت	۶	معرفت قرآن	۲۱
طیبات دنیا، طیبات آخرت	۷	بڑا ظرف	۲۲
حامل کتاب	۸	امر بالمعروف، نہی عن المنکر	۲۳
جنت کی قیمت	۹	کامیابی کا راز	۲۴
فرق کیوں	۱۰	ایک پیغام	۲۶
فرضی نام	۱۱	ایک غلطی	۲۸
اس کا سبب	۱۲	تجربہ کی زبان سے	۲۹
دنیا کا جوڑا	۱۳	اصلاح کا طریقہ	۳۱
سب وشتم	۱۴	قومی بیداری	۳۲
دو قسم کے انسان	۱۵	تزکیہ کیا ہے	۳۳
غلط توجیہہ	۱۶	سفرنامہ قسط ۲	۳۴
ہر چیز کا امتحان	۱۷	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۷
دونوں ڈوب گئے	۱۸	اعلان اجتماع	۵۰

AL-RISALA (URDU) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone: 611128, 697333; Fax: 91-11-3312601 (Attn: Tel. 697333)
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US$25 (Air Mail)

نوعیّتِ حیات

ہر آدمی موت کی زد میں ہے۔ ہر آدمی جو زندہ ہے اس کو بہر حال ایک روز مر جانا ہے۔ ہر آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ اس کی دیکھنے والی آنکھیں بند ہو جائیں۔ جب اس کی بولنے والی زبان خاموش ہو جائے۔ جب اس کے چلنے والے قدم ٹھہر کر رہ جائیں۔ جب وہ زندہ انسان کے بجائے مردہ انسان کہا جانے لگے۔

مگر یہ موت خاتمۂ حیات نہیں، وہ ایک نیا آغازِ حیات ہے۔ موت وجود سے عدم کی طرف سفر نہیں بلکہ وہ خود زندگی کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ کی طرف سفر ہے۔ وہ اختیار کے دور سے گزر کر بے اختیاری کے دور میں داخل ہونا ہے۔

جو شخص بھی اپنے آپ کو موجودہ دنیا میں چلتا پھرتا پاتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے نوعیتِ حیات کو سمجھے۔ اس دنیا میں اسے کیوں بسایا گیا ہے۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کا معیار کیا ہے۔ ان سوالات کے جواب کو جاننا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ آدمی اپنی زندگی کا صحیح رخ متعین کر سکے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو حقیقی کامیابی کی سمت میں چلا سکے۔

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ یہاں جو کچھ بھی کسی آدمی کو ملتا ہے وہ اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس دنیا میں ملی ہوئی ہر چیز کو اس طرح استعمال کرے جس طرح ایک طالب علم امتحان ہال کی چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ کیونکہ اسی استعمال کے صحیح یا غلط ہونے پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے آپ کو اختیار کی حالت میں پاتا ہے۔ مگر یہ اختیار اس جانچ کے لیے ہے کہ آدمی اپنے اختیار کو صحیح ڈھنگ پر استعمال کرتا ہے یا غلط ڈھنگ پر۔

آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو بے اختیار کر لے۔ وہ اپنی خواہش پر چلنے کے بجائے اصول حق کی پیروی کرے۔ وہ اپنی انا کو اپنا رہنما بنانے کے بجائے اس قادرِ مطلق کو اپنا رہنما بنائے جس نے اس کو پیدا کر کے اس دنیا میں رکھا ہے اور جو آخر کار اس کا حساب لینے والا ہے۔

صرف ایک بار

موجودہ دنیا میں لذتِ طلب ہے، مگر یہاں لذتِ حصول نہیں۔ یہاں منزل کی طرف دوڑنا ہے، مگر یہاں کسی کے لیے اپنی مطلوب منزل پر پہونچنا مقدر نہیں۔

ایک شخص زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوتا ہے۔ وہ کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لیے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ مگر کامیاب زندگی پالینے کے باوجود اس کا احساس محرومی ختم نہیں ہوتا۔

اپنے نشانہ کے مطابق، جب آدمی قابل اعتماد جاب، اچھی کار، فرنشڈ مکان، حاصل کرلیتا ہے تو اس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہ کرسکا۔ اب زندگی اس کے لیے "عیش" نہیں رہتی، بلکہ زندگی اس کے لیے صرف "ذمہ داری" بن کر رہ جاتی ہے۔

آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف کھونے کی طرف تیزی کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ آدمی اس گمان میں مبتلا ہے کہ وہ اپنے مطلوب کو حاصل کر رہا ہے، حالانکہ اس کے برعکس اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے مطلوب سے دور ہوتا جارہا ہے۔ وہ اپنا سفر برعکس سمت میں جاری کیے ہوئے ہے۔ اور جو شخص جتنا زیادہ تیز رفتار ہے اتنا ہی زیادہ تیزی کے ساتھ وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جارہا ہے۔

آدمی کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو اپنا نشانہ بنایا۔ آدمی کے لیے صحیح بات یہ تھی کہ وہ آخرت کو اپنا نشانہ بنائے۔ آدمی کو جاننا چاہیے کہ دنیا صرف بیج بونے کی جگہ ہے، وہ فصل کاٹنے کا مقام نہیں۔ جو آدمی دنیا کو چاہے، اس نے ایسی چیز کو چاہا جو سرے سے ملنے والی نہیں۔ عقل مند وہ ہے جو آخرت کا طالب بنے۔ کیوں کہ آخرت ہی حقیقی ہے، اور وہی وہ چیز ہے جس کو کوئی پانے والا موت کے بعد کی زندگی میں اپنے لیے پائے گا۔

زندگی کا سب سے زیادہ سنگین پہلو یہ ہے کہ یہ زندگی کسی کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ آدمی کو صرف ایک بار عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صرف ابدی انجام ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے استعمال کے معاملہ میں انتہائی حد تک سنجیدہ اور محتاط ہو، وہ اپنی زندگی کا رخ متعین کرنے میں آخری حد تک باہوش انسان بن جائے۔

ہدایت وضلالت

قرآن کتاب ہدایت (البقرہ ۱۸۵) ہے۔ بظاہر یہ ہونا چاہیے کہ آدمی کو قرآن سے صرف رہنمائی ملے۔ مگر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اس قرآن کے ذریعہ بہت سے لوگوں کو گم راہ کرتا ہے اور وہ بہت سے لوگوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے (یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا) البقرہ ۲۶

یہاں یہ سوال ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو قرآن سے ہدایت ملتی ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو قرآن کو پڑھنے کے باوجود گم راہ ہو جاتے ہیں، اس کا جواب خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ اگرچہ حق وصداقت کی کتاب ہے۔ مگر اس سے ہدایت صرف اس شخص کو ملتی ہے جو متقی ہو (البقرہ ۲) دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ فاسق ہوں، ان کو قرآن سے ضلالت اور گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا (البقرہ ۲۶)

اب دیکھئے کہ متقی ہونا کیا ہے اور فاسق ہونا کیا ہے۔ متقی کا لفظ تقوی (وقی یقی) سے بنا ہے۔ عربی میں اس کے اصل معنی بچنے کے ہیں۔ یعنی معاملات میں محتاط ہونا (to be cautious of) قرآن میں ہے کہ: فمن اتقی واصلح (الاعراف ۳۵) یعنی جس شخص نے احتیاط کا انداز اختیار کیا اور بچ بچ کر زندگی گزاری، وہ آخرت میں خوشیوں کی زندگی حاصل کرے گا۔

فاسق کا لفظ فسق سے نکلا ہے۔ عربی میں فسق کے معنی ہیں نکلنا، درست طریقہ سے ہٹ جانا (to go astray) قرآن میں ابلیس کے لیے آیا ہے: ففسق عن امر ربہ (الکہف ۵۰) یعنی ابلیس نے خدا کے حکم کو سیدھی طرح نہیں اپنایا، وہ خدا کے حکم سے ہٹ گیا۔

تقوی اور فسق، اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں سنجیدگی (sincerity) اور غیر سنجیدگی (insincerity) کہا جاتا ہے۔ قرآن سے سچی رہنمائی صرف اس شخص کو ملتی ہے جس کے اندر سنجیدگی کا مزاج ہو۔ جو آدمی اپنے مزاج کے اعتبار سے غیر سنجیدہ ہو، اس کو قرآن سے کبھی رہنمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن سے ہدایت پانے کی شرط یہ ہے کہ آدمی خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھے۔ جو شخص خالی الذہن نہ ہو وہ قرآن میں اپنے آپ کو پائے گا نہ کہ قرآن کو۔

طیباتِ دنیا، طیباتِ آخرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ——— ہر شخص کے لیے اس کے عمل کے اعتبار سے آخرت میں درجے ہوں گے۔ اور تاکہ اللہ سب کو ان کے اعمال پورے کر دے اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔ اور جس دن انکار کرنے والے لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے۔ ان سے کہا جائے گا کہ تم اپنی طیبات (اچھی چیزیں) دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم دنیا میں نافرمان بنے رہے (الاحقاف ۲۰-۱۹)

اس آیت میں طیبات سے مراد مطلق طیبات نہیں ہیں بلکہ ترجمی طیبات ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو شخص دنیا کی اچھی چیزوں کو برتے گا وہ آخرت کی اچھی چیزوں سے محروم رہے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف آخرت کی طیبات ہوں اور دوسری طرف دنیا کی طیبات، اس وقت جو شخص آخرت کی طیبات کو نظر انداز کر دے، اور اس کو چھوڑ کر دنیا کی طیبات کی طرف دوڑ پڑے، وہ جب آخرت میں پہونچے گا تو وہاں اس کے لیے آخرت کی طیبات میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

مزید یہ کہ یہاں اصلاً ماکولات و مشروبات یا دنیوی عیش مراد نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق اس آیت سے صرف ضمنی ہے۔ اس آیت کا تعلق براہ راست طور پر ان چیزوں سے ہے جو آدمی کو کبر (گھمنڈ) اور فسق (نافرمانی) تک پہونچاتی ہیں۔

اس آیت کا خطاب اصلاً ان لیڈروں سے ہے جنھوں نے اپنی لیڈری کی خاطر حق کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کے تقاضوں کے مقابلہ میں عوامی خواہشات کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ ان کی عوامی مقبولیت میں کمی نہ آنے پائے۔ جو اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لیے حق کے آگے نہیں جھکتے۔ جو اپنی قوم کے سرکشوں کی مذمت نہیں کرتے، کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے اندر اپنا مقام کھو دیں گے۔ جو یہ سوچ کر بولتے ہیں کہ اپنے ہم قوموں کے درمیان اپنی مقبولیت کو باقی رکھیں اور ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو انھیں آخرت میں مقبولیت کا درجہ دینے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا آخرت کی اچھی چیزوں میں کوئی حصہ نہ ہوگا، کیوں کہ وہ اپنی اچھی چیزیں اسی دنیا میں لے چکے۔

حامل کتاب

قرآن میں بنی اسرائیل (یہود) کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا، پھر وہ اس کے حامل نہ بن سکے، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (الجمعہ ۵)

اس آیت کے مطابق، کسی گروہ کے لیے حامل کتاب ہونے کے دو درجے ہیں، ایک یہ کہ وہ "انسان" کے طور پر اس کا حامل بنے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ "حیوان" کے طور پر اس کا حامل بنا ہوا ہو۔

ایک حقیقی انسان جب کتابِ خداوندی کا حامل ہو تو اس کا پورا وجود اس کتاب کا حامل بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا ہر جزء اس میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے حرکت میں آجاتا ہے۔ ایک طرف اس کا جسمانی ہاتھ اس کتاب کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے، دوسری طرف اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی سوچ اسی کے رخ پر چلتی ہے۔ اس کے تمام ذہنی نقشے اسی کی تعلیمات کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔ اس کا شعور پوری طرح اس کے فکری سانچہ میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی محبتوں کا مرجع وہی ہوتا ہے جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے، اس کے خوف اور اندیشوں کی بنیاد اسی کتاب کی تعلیمات ہوتی ہیں۔ وہ وہی چاہتا ہے جو اس کتاب کے مطابق چاہنا چاہیے اور ان چیزوں کو چاہنے سے رک جاتا ہے جن کی بابت اس کتاب میں منع کر دیا گیا ہے۔

دوسرا درجہ حیوان کی سطح پر حامل کتاب بننے کا ہے۔ ایسے لوگوں کا "جسم" تو کتاب الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے مگر ان کی "روح" کتاب الٰہی کی حامل نہیں ہوتی۔ ظاہری طور پر وہ اپنے ہاتھ میں خدا کی کتاب کو تھامے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کا دل اور دماغ اس روشنی اور حرارت سے خالی ہوتا ہے جو اس کتاب کو اپنانے کے نتیجہ میں کسی کے اندر پائی جانی چاہیے۔

وحی الٰہی کا حامل صرف وہ ہے جو روح کی سطح پر وحی کا حامل ہو۔ جو لوگ جسم کی سطح پر اس کے حامل ہوں ان کی مثال اس حیوان کی سی ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو مگر اس کا باطن اس کی نورانیت سے خالی ہو۔

کتابِ خداوندی کے حامل صرف وہ لوگ ہیں جو انسان کی حیثیت سے اس کتاب کے حامل بنیں۔

جنّت کی قیمت

دنیا میں آدمی سطحیت کی قیمت پاتا ہے، آخرت میں آدمی معنویت کی قیمت پائے گا ——— یہی ایک لفظ میں دنیا اور آخرت کے معاملہ کا خلاصہ ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور ان چیزوں کی طرف بالکل نہ دیکھو جن کو ہم نے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لیے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے (ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیاة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وابقی) طٰہٰ ۱۳۱

ایک شخص جس کو دنیا کی رونقیں ملی ہوئی ہوں، بظاہر وہ لوگوں کو قابلِ رشک دکھائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ قابلِ رحم ہے۔ کیوں کہ اس کے گرد رونقوں کی فراہمی یہ بتاتی ہے کہ وہ خدا کی آزمائش میں ناکام ہوگیا۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہر آن دو چیزوں کے درمیان ہے۔ اس کے ایک طرف معنوی حقیقتیں ہیں۔ اور دوسری طرف ظاہری رونقوں والی چیزیں۔ جو آدمی معنوی حقیقتوں پر دھیان دے، وہ ظاہری رونقوں کی رعایت نہیں کر پاتا، اس لیے وہ ان کو حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ظاہری رونقوں والی چیزوں میں دل چسپی لے، وہ ان کی خوب رعایت کرتا ہے۔ اس لیے وہ ان کو پانے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر یہ پانا ایک محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے "زہرۂ دنیا" کو پایا، مگر وہ "رزق رب" کی زیادہ قیمتی چیز کو نہ پا سکا۔

جنّت کو پانا آسان ہے۔ مگر جنّت کسی آدمی کو ایک مہنگی قیمت پر ملتی ہے۔ اور وہ ہے ——— ظواہر کے کھونے کو برداشت کرنا، اور معانی کو پاکر اس پر راضی رہنا۔ ظواہر میں محنت کا فائدہ نقد ملتا ہے، اور معانی میں محنت کا فائدہ ادھار رہتا ہے۔ ظواہر میں محنت کرنے والوں کو دولت، بھیڑ، عہدہ، عزت، ہر چیز فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس معانی میں محنت کرنے والے کو جو کچھ ملے گا آخرت میں ملے گا۔

ظواہر سے محرومی پر راضی ہونا گویا ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ یہی جنّت کی قیمت ہے۔ جو لوگ اس ناقابل برداشت کو برداشت نہ کریں وہ جنّت میں داخلہ کی خوشی بھی نہیں پائیں گے۔

فرق کیوں

۱۹۷۱ کا واقعہ ہے۔ ایک سفر کے دوران میں لاہور (پاکستان) میں ایک صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ میرے میزبان ایک روز رات کے وقت مجھ کو چھت کے اوپر لے گیے۔ اس وقت پورا چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور کھلی فضا میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ ہم لوگ قدرت کے حسین منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ اچانک میرے میزبان نے کہا: "یہی چاند تو آپ کے ملک میں بھی چمکتا ہوگا۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گیے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ کیسی عجیب بات ہے۔ چاند ہر ملک میں چاند ہے۔ مگر انسان ہر ملک میں انسان نہیں۔ ایک شخص اپنے ملک میں "وطنی" سمجھا جاتا ہے، مگر دوسرے ملک میں وہ "خارجی" بن جاتا ہے۔

چاند کو جس طرح ایک ملک میں خوش آمدید کہا جاتا ہے، اسی طرح دوسرے ملک میں بھی۔ سورج ایک ملک کے لیے بھی محبوب ہے اور دوسرے ملک کے لیے بھی۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ ایک ملک کا مطلوب شخص دوسرے ملک میں پہونچ کر غیر مطلوب بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند اور سورج اپنی فطرت پر قائم ہیں۔ جب کہ انسان اپنی مقرر فطرت پر قائم نہیں۔

سورج چاند ایسا نہیں کرتے کہ ایک ملک میں اجالا پھیلائیں اور دوسرے ملک میں اندھیرا۔ مگر انسان ایک قوم کا دوست اور دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ پھول کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کو خوشبو دے اور دوسرے کے لیے بدبو دار بن جائے۔ مگر انسان ایک کے لیے خیر خواہ ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے بدخواہ۔ ستارے اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں۔ کوئی ستارہ دوسرے ستارہ کے مدار میں داخل نہیں ہوتا۔ مگر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے دائرے کو چھوڑ کر دوسرے کے دائرہ میں داخل ہوتا ہے۔ درخت ایک ملک میں جس اصول پر اگتا ہے، دوسرے ملک میں بھی اسی اصول پر اگتا ہے۔ مگر انسان ایک کے ساتھ عدل کا معاملہ کرتا ہے، اور دوسرے کے لیے وہ ظالم بن جاتا ہے۔

دوسری چیزوں کی محبوبیت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت پر قائم ہیں۔ مگر انسان اپنی فطرت کو کھو دیتا ہے اور نتیجۃً غیر مطلوب بن جاتا ہے۔ اگر انسان اپنی فطرت پر قائم رہے تو اس کو بھی ہر جگہ وہی استقبال ملے جو سورج اور چاند کو ملا ہوا ہے۔

فرضی نام

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ پیغمبروں نے جب اپنی قوموں کے سامنے توحید خالص کی دعوت پیش کی اور ان کے مزعومہ شریکوں کا انکار کیا تو لوگوں نے سخت ردِ عمل کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم صرف ایک اللہ کے عبادت گزار بنیں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔ پیغمبر نے جواب دیا کہ کیا تم لوگ مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں، جن کی کوئی سند خدا نے نہیں اتاری (اتجادلونني في اسماء سميتموها انتم وابآءكم ما نزل الله بها من سلطان) الاعراف ۷۱

نام رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عاجز چیز کو طاقت ور چیز کہنا۔ ایک پتھر کی مورت کو ایسے نام سے پکارنے لگنا جو اس کے لیے سزاوار نہیں۔ مثلاً قدیم عرب میں قبیلۂ قریش کا ایک بت تھا جس کو وہ پوجتے تھے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف ایک بے جان پتھر تھا۔ مگر قریش نے اس کا نام عُزّیٰ رکھ دیا تھا۔ عُزّیٰ کا لفظ اعزّ کا مؤنث ہے۔ یعنی بہت معزز، بہت طاقت ور۔

قدیم زمانہ میں اس طرح کے بے اصل نام زیادہ تر بتوں کے ہوا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں پریس کے رواج نے اسی نوعیت کی ایک اور برائی کو بہت بڑے پیمانہ پر پیدا کیا ہے۔ اس نئی برائی کو اکابر پرستی کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر قوم اپنی محبوب شخصیتوں کو بڑے بڑے لقب دیتی ہے۔ اس لقب کو پریس اور میڈیا کے ذریعہ مشہور کر کے لوگوں کے دماغوں میں اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے کہ وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ شخصیتیں واقعۃً ویسی ہی ہیں جیسا کہ ان کے لقب میں انھیں بتایا گیا ہے۔

قطب الاقطاب، غوث الاعظم، قائد اکبر، حکیم مشرق، حضرت اقدس، مجاہد اسلام، علامۂ زماں، شہید اعظم، مجتہد العصر، امام حریت، وغیرہ، سب اسی قسم کے نام ہیں جو لوگوں نے بطور خود رکھ لیے ہیں۔ انھیں مفروضہ القاب کا یہ نتیجہ ہے کہ ان شخصیتوں پر کوئی تنقید کی جائے تو لوگ فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں شخص تو "حضرت اقدس" ہے، اس پر کیسے تنقید کی جا سکتی ہے، حالاں کہ حضرت اقدس کچھ لوگوں کا اپنا گھڑا ہوا نام ہے نہ کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا لقب۔

اس کا سبب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: او یلبسکم شیعًا فیذیق بعضکم باس بعض (یا تم کو گروہوں میں بانٹ دے اور پھر ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے)

اس آیت میں جس صورت حال کا ذکر ہے اس کی نسبت بظاہر خدا کی طرف کی گئی ہے۔ مگر دراصل اس کی نسبت انسان کی طرف ہے۔ یعنی بدلے ہوئے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مختلف گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑو گے۔ مذکورہ اسلوب صرف اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا سے بے تعلق ہو جاؤ گے تو تمہارا حال یہ ہو جائے گا کہ تم آپس میں لڑنے لگو گے۔

ساری تاریخ میں ایسا ہوا ہے کہ انسان لڑتا رہا ہے۔ ایک شخص اپنی طاقت کا مزہ دوسرے شخص کو چکھاتا رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہر ایک یکساں حالت میں نہیں رہتا۔ کوئی کمزور ہوتا ہے اور کوئی طاقت ور۔ اب جو طاقت ور ہوتا ہے اس کے اندر اپنی طاقت کا گھمنڈ آجاتا ہے۔ اس کو اگر کسی سے شکایت پیدا ہو جائے تو فوراً وہ اپنی طاقت اس کے اوپر آزمانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کو اپنی برتری قائم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

اس صورت حال سے بچانے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ اس کو یقین ہو کہ میرے اوپر ایک اور ہستی ہے جو مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر میں نے اپنی طاقت کا غلط استعمال کیا تو وہ مجھ کو ضرور اس کی سزا دے گا۔

مسلمانوں میں جب اللہ کا خوف ہو تو ہر آدمی تواضع کی نفسیات میں جی رہا ہوتا ہے۔ تواضع کی نفسیات اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ دوسرے سے لڑے، وہ دوسرے کو اپنی طاقت کا مزہ چکھائے۔

اس کے برعکس جب مسلمانوں میں اللہ کا خوف باقی نہ رہے تو وہ سرکشی کی نفسیات میں جینے لگتے ہیں۔ سرکشی کی نفسیات ہر آدمی کو بے لگام بنا دیتی ہے۔ جس شخص کے پاس بھی کوئی طاقت ہو وہ اپنی اس طاقت کو دوسروں کے اوپر استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔

خدا کے خوف سے امن کا سماج بنتا ہے، اور خدا سے بے خوفی سے بے امنی کا سماج

دنیا کا جوڑا

والارض فرشناها فنعم الماهدون۔ ومن کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔ ففروا الی اللہ انی لکم منہ نذیر مبین (الذاریات ۴۸-۵۰)

اور ہم نے زمین کو بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں اس کی طرف سے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔

اس دنیا کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی صورت میں ہے۔ ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کی تکمیل کرتی ہے ——— ایٹم میں منفی اور مثبت ذرہ، نباتات اور حیوانات میں نر اور مادہ، انسان میں عورت اور مرد۔ وغیرہ۔ حتی کہ فلکیاتی مشاہدہ کے مطابق ستارے بھی جوڑے جوڑے کی صورت میں ہیں۔

دنیا کا یہ نظام آدمی کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس کائنات میں جب ہر چیز کا جوڑا ہے تو زمین کا جوڑا کہاں ہے۔ ہماری زمین خلا کے اندر ایک تنہا قسم کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ یہ آباد اور شاداب کرہ اکیلا نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ اس کا بھی ایک جوڑا موجود ہو۔

قرآن اسی عقلی تقاضے کی تصدیق ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے دنیا کو بھی، دوسری تمام چیزوں کی طرح، جوڑے کی صورت میں بنایا ہے۔ چنانچہ یہاں ایک ارض الدنیا ہے، اور دوسری ارض الجنۃ (الزمر ۷۴)، موجودہ عالم (ارض الدنیا) میں انسان کا قیام برائے آزمائش ہے، دوسرے عالم (ارض الجنۃ) میں انسان کا قیام برائے انعام ہوگا۔ موجودہ دنیا اپنے اخروی جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے وجود کو مکمل کرتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو عالم پیدا کیے۔ ایک کامل اور دوسرا غیر کامل۔ ایک باقی اور دوسرا فانی۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ ایک لامحدود اور دوسرا محدود۔ ایک عالم کو اس نے فرشتوں کے انتظام میں رکھا اور دوسرے کو انسانوں کے انتظام میں دیدیا۔

یہاں آدمی کا قیام برائے امتحان ہے، اگلی دنیا میں اس کا قیام بطور انعام ہوگا۔ جو لوگ موجودہ عالم امتحان میں اپنے کو اہل ثابت کریں گے وہ اگلی کامل اور معیاری دنیا میں جگہ پائیں گے۔ اور جو لوگ اس عالم امتحان میں ناکام رہیں گے وہ ہمیشہ کے لیے کائناتی کوڑا خانہ میں پھینک دیئے جائیں گے۔

سب وشتم

قرآن میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو۔ ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالی دیں گے (ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم) الانعام ۱۰۹۔

ایک طرف اس قرآنی حکم کو سامنے رکھیے۔ دوسری طرف یہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب اسلام کی دعوت پیش کی تو وہاں کے سرداروں نے آپ پر یہ الزام لگایا کہ وہ ہمارے آباء کو گالی دیتے ہیں اور ہمارے معبودوں کو گالی دیتے ہیں (۔۔۔ شتم اٰباءنا وسب اٰلھتنا) سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۳۱۰

کیا قرآن کے اس حکم کے باوجود، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے اکابر کو اور ان کے بتوں کو گالی دیتے تھے۔ ہرگز نہیں۔ حدیث اور سیرت کے پورے ذخیرہ میں ایسا کوئی کلام آپ کی زبان سے منقول نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آپ گالی نہیں دیتے تھے۔ البتہ آپ کی بات کو وہ گالی بتاتے تھے تاکہ آپ کو سب وشتم اور دشنام طرازی کا ذمہ دار ٹھہرا کر آپ کو مطعون کریں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وہ ابطالِ باطل تھا نہ کہ سب وشتم۔ آپ ان کے جاہلانہ مذہب یا ان کے اکابر کے خلاف دشنام طرازی نہیں کرتے تھے، بلکہ واضح دلائل سے ان کی تردید کرتے تھے۔ آپ اثبات حق اور ابطالِ باطل والا کام انجام دیتے تھے۔ قریش چونکہ آپ کی دلیلوں کے مقابلہ میں کوئی دلیل اپنے پاس نہیں پاتے تھے، اس لیے انھوں نے آپ کے بارہ میں کہہ دیا کہ آپ سب وشتم کرتے ہیں۔

جب آدمی کے غلط نظریہ کو طاقت ور دلائل سے رد کر دیا جائے، اس کے باوجود وہ اپنے غلط نظریہ کو چھوڑنا نہ چاہے تو وہ داعی اور مصلح کے اوپر سب وشتم کا الزام لگا دیتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے جو دلیل دی ہے وہ کوئی دلیل نہیں، وہ تو صرف دشنام طرازی ہے اور میں دشنام طرازی کی بنا پر کیسے اپنا موقف بدل دوں ـــــ جو لوگ مدلل تنقید کو کیچڑ اچھالنا کہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کس کے ساتھ بریکٹ کر رہے ہیں۔

دو قسم کے انسان

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ، فبشر عباد۔ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب۔

(الزمر ۱۷-۱۸)

اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے، ان کے لیے خوش خبری ہے۔ تو میرے بندوں کو خوشخبری دیدو، جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر چیز پر شبہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ مزید یہ کہ موجودہ دنیا میں جب کلام کیا جاتا ہے تو انسانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ کسی بات کا غلط مفہوم نکالا جا سکے۔

جو سمجھ والے لوگ ہیں اور جن کو اللہ کے خوف نے سنجیدہ بنا رکھا ہے، وہ جب کسی بات کو سنتے ہیں تو ہمیشہ اس کو اس کے صحیح مفہوم میں لیتے ہیں۔ وہ الفاظ کو نہیں پکڑتے بلکہ کلام کے معانی کو دیکھتے ہیں۔ ان کی یہ صفت ان کو کلام کے صحیح مفہوم کی طرف رہنمائی کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں، جو ربانی حکمت سے محروم ہو گئے ہوں۔ وہ جب کسی کلام کو سنتے ہیں تو وہ اس کی خود ساختہ تاویل کرتے ہیں۔ وہ سیدھی بات کو الٹے معنی پہناتے ہیں۔ وہ کسی بات کو اس کے اصل مفہوم کے اعتبار سے نہیں لیتے بلکہ محض ظاہری الفاظ کے اعتبار سے لے کر اس پر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ ہدایت سے محروم رہتے ہیں۔

یہ شیطان کی پیروی ہے کہ آدمی کسی کلام کو اس کے اصل مفہوم کے اعتبار سے نہ لے۔ جو اللہ کے سچے بندے ہیں وہ ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کلام سے متکلم کا اصل منشا کیا ہے۔ وہ کلام کو اس کے احسن مفہوم کے اعتبار سے لیتے ہیں نہ کہ غیر احسن مفہوم کے اعتبار سے۔

غلط توجیہہ

وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ۔ کذلک، لنثبت بہ فؤادک ورتلناہ ترتیلا (الفرقان ۳۲)

اور انکار کرنے والوں نے کہا کہ اس کے اوپر پورا قرآن کیوں نہیں اتارا گیا۔ ایسا اس لئے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔

قرآن بیک وقت کتابی مجموعہ کی صورت میں نہیں اتارا گیا۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال کے دوران اتارا گیا۔ اس واقعہ کو لے کر مکہ کے منکرین نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدا کی کتاب نہیں۔ خدا کے لیے یہ مشکل نہیں کہ وہ ایک ہی وقت میں پوری کتاب بھیج دے۔ محمد ایک امی انسان ہیں، ان کے لیے البتہ بیک وقت پوری کتاب پیش کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ وہ عرب کے کچھ لوگوں کی مدد سے اس کا تھوڑا تھوڑا حصہ تیار کرتے ہیں اور جتنا حصہ تیار ہوتا ہے اتنا لوگوں کو سنا دیتے ہیں (الفرقان ۴)

یہ تاخیر نزول کی غلط توجیہہ تھی۔ فرمایا کہ پورا قرآن بیک وقت سامنے نہ لانے کا سبب تیاری کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ترتیل یا تدریج کا مسئلہ ہے (قال الرازی: الترتیل فی الکلام ان یأتی بعضہ علی اثر بعض)

نزول میں تاخیر بجائے خود ایک واقعہ تھی۔ مگر اس کی یہ توجیہہ بے بنیاد تھی کہ اس کا سبب تیاری کا مسئلہ ہے۔ مگر یہ بے بنیاد توجیہہ اتنی پرفریب ثابت ہوئی کہ بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو گیے۔ حتی کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی تردید کرنی پڑی۔ قرآن میں یہ بتایا گیا کہ تدریج کی مصلحت کی بنا پر نزول میں یہ تاخیر کی جاتی ہے نہ کہ تیاری کی مشکل کی بنا پر۔

یہ دنیا آزمائش گاہ ہے۔ یہاں حقائق پر التباس و اشتباہ کا پردہ ہے۔ اس لیے یہاں ایک فتنہ پرور شخص کے لیے ہمیشہ یہ موقع رہے گا کہ وہ ایک صحیح بات کی گمراہ کن توجیہہ کر سکے۔ وہ ایک سیدھی بات کو ٹیڑھی بات بنا کر پیش کرے۔

یہ موقع قیامت تک کھلا رہے گا۔ قیامت سے پہلے یہ موقع کسی سے چھینا جانے والا نہیں۔

ہر چیز امتحان

ل نفس ذائقة الموت ونبلوكم بالشر	ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہم تم کو بری حالت
لخير فتنة والينا ترجعون۔	سے اور اچھی حالت سے آزماتے ہیں پرکھنے کے
(الانبیاء ۳۵)	لیے۔ اور تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔

قرآن کی یہ آیت انسانی زندگی کے بارہ میں خدا کے منصوبہ کو بتاتی ہے۔ اس دنیا میں کسی کو حت ملتی ہے اور کسی کو مصیبت۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پسندیدہ صورت حال سے سابقہ یش آتا ہے اور کبھی ناپسندیدہ صورت حال سے۔ مگر ان سب کا مقصد صرف ایک ہے، اور وہ زمائش ہے۔ خدا کسی کو ایک طرح کے حالات میں رکھ کر آزماتا ہے اور کسی کو دوسری طرح کے الات میں رکھ کر۔ یہاں اصل چیز حالات نہیں ہیں، یہاں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کو جو الات ملے ان میں اس نے کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔

اس دنیا میں کسی کو عزت اور کامیابی دی جاتی ہے تو وہ اس کے لیے انعام نہیں ہوتا ہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ خدا یہ دیکھے کہ آدمی عزت اور کامیابی پاکر گھمنڈ میں مبتلا ہوا یا اس نے شکر اور تواضع کا رویہ اختیار کیا۔ اسی طرح جب کسی شخص کو بظاہر پستی اور ناکامی میں ڈالا جاتا ہے تو یہ اس کے لیے سزا نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے ہوتی ہے کہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ پستی ور ناکامی میں مبتلا ہوکر اس نے صبر کا رویہ اختیار کیا یا بے صبری اور شکایت کا۔ ی ردعمل پر خرت میں آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جانے والا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو جب اپنے حق میں بعض غیر معمولی نعمتوں کا تجربہ ہوا تو ان کی زبان سے نکلا کہ یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے جانچے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری (لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ، النمل ۴۰)

ایک طالب علم کو امتحان میں ۲۰ پرچے کے بجائے ۵ پرچہ دیا جائے تو وہ خوش ہوگا کہ مجھ کو ل کرنے کے لیے کم پرچہ ملا۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جس آدمی کو کم ساز و سامان ملے یا کم عہدہ دیا ائے تو اس کو شکر کرنا چاہیے کہ اس کے رب نے اس کے ساتھ آسان آزمائش کا معاملہ کیا۔ نہ یہ کہ ہ اس کمی کی بنا پر شکایت اور حسد اور مایوسی جیسے جذبات میں مبتلا ہو جائے۔

دونوں ڈوب گیے

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے لوگو، ایک مثال بیان کی جاتی ہے تو تم اس کو غور سے سنو۔ تم لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ وہ سب کے سب اس کے لیے جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب بھی کمزور اور مطلوب بھی کمزور۔ انھوں نے اللہ کی قدر نہ پہچانی جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے۔ بے شک اللہ طاقت ور ہے، غالب ہے (الحج ۷۳-۷۴)

اس معاملہ کی ایک دلچسپ مثال انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۱ مارچ ۱۹۹۰) میں نظر سے گزری۔ حیدرآباد میں بدھا کی مورتی (اسٹیچو) لگانے کا ایک منصوبہ بنایا گیا۔ اس پورے منصوبہ کی لاگت ۵۸ کروڑ ۵۸ لاکھ روپیہ تھی۔ صرف مورتی کی لاگت ۸۰ لاکھ روپیہ تھی۔ یہ مورتی نہایت اہتمام سے بنوائی گئی۔ اس کا انشورنس ۳ کروڑ ۷ لاکھ روپیہ تھا اور تیاری کے دوران مہاراشٹر کے چیف منسٹر ڈاکٹر چنا ریڈی روزانہ اس کے معائنہ کے لیے جاتے تھے۔ اس مورتی کا وزن تقریباً ۳۰۰ ٹن تھا، اور وہ ۷۵ فٹ اونچی تھی۔

۱۰ مارچ ۱۹۹۰ کو بدھا کی یہ مورتی حسین ساگر جھیل کے کنارے ایک مخصوص کشتی پر رکھی گئی۔ اس کو جھیل میں آدھے کیلومیٹر کا سفر طے کر کے مقررہ مقام پر پہونچنا تھا جہاں اس کو نصب کرنے کے لیے ایک مخصوص پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر پر ۲ کروڑ ۳۲ لاکھ روپیہ کی لاگت آئی تھی۔ مگر کشتی جب جھیل کے درمیان پہونچی تو وہ اندر پانی آجانے کی بنا پر (یا اور کسی وجہ سے) ڈوب گئی۔ مورتی سمیت آٹھ آدمی بھی سات میٹر نیچے پانی کی تہہ میں چلے گیے۔

انسان ایک اللہ کے سوا دوسری چیزوں کا بت بناتا ہے، وہ ان کو مقدس سمجھتا ہے اور ان کو پوجتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بت (اور اسی طرح صاحبانِ مزار) اپنے اندر کوئی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، وہ دوسرے کی حفاظت کیا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اسی کی پرستش کرے اور اسی سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کرے۔ اللہ کے سوا جو چیزیں ہیں وہ خود محتاج ہیں، وہ دوسروں کی کیا مدد کر سکتی ہیں۔

دین کے نام پر دنیا

اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے اندر جو دینی خرابیاں پیدا ہوئیں ، ان کا قرآن میں تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے ۔ ان میں سے ایک خرابی وہ ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے بدلے دنیا خریدتے ہیں (اشتروا بآیاتِ اللہِ ثمناً قلیلاً، التوبہ ۹) یہ بات قرآن میں بار بار بتائی گئی ہے ۔ مثلاً البقرہ ۷۹، آل عمران ۱۸۷، المائدہ ۴۴ ، وغیرہ ۔

اس قسم کی خرابی ہمیشہ بعد کے زمانہ میں پیدا ہوتی ہے ۔ کیوں کہ دورِ اول میں کوئی پیغمبر یا پیغمبر کا لایا ہوا دین اس حالت میں ہوتا ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو اپنے لیے دنیا تجارت کا ذریعہ بنائے ۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فلسطین میں نبوّت کی ۔ اس وقت فلسطین کے کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ " دین مسیح " کے نام پر دنیوی فائدہ حاصل کرے ۔ جب کہ آج مسیحی چرچ حضرت مسیح کے نام پر ساری دنیا میں بہت بڑا مذہبی کاروبار قائم کئے ہوئے ہے ۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ابتدائی دور میں جب مکہ میں تھے تو اس وقت یہ ناقابل تصور تھا کہ کوئی شخص " دینِ محمد " یا آپ کی لائی ہوئی کتاب کے نام پر کوئی مادی فائدہ حاصل کرے ۔ مگر آج ساری دنیا میں " دین محمد " یا قرآن اور اسلام کے نام پر بہت بڑے پیمانہ پر مادی فائدے حاصل کئے جارہے ہیں ۔

ایسا کیوں ہے ۔ یہ دراصل زمانی فرق کا معاملہ ہے ۔ پیغمبر کا دین اپنے ابتدائی دور میں حدیث کی زبان میں ، " غریب " ہوتا ہے ۔ اس وقت انسانی سماج کے اندر اس کی جڑیں نہیں ہوتیں ۔ اس کی بنیاد پر بڑے بڑے ادارے قائم نہیں ہوتے ۔ اس کے ماننے والوں کا کوئی طاقت ور طبقہ موجود نہیں ہوتا ۔ اس وقت پیغمبر کا دین صرف ایک تصور ہوتا ہے ۔ اس وقت اس کی پشت پر صرف لفظی دلیل کا زور ہوتا ہے ، اس کے سوا اور کچھ نہیں ۔

مگر بعد کو صورت حال بدل جاتی ہے ۔ اب پیغمبر کو ماننے والے کروروں کی تعداد میں ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں ۔ بڑے بڑے ادارے اس کی عظمت کی تصدیق کرنے کے لیے ہر طرف موجود ہوتے ہیں ۔ کسی مذہب کا یہی دوسرا دور ہے جب کہ اس کے ماننے والوں میں وہ خرابی پیدا ہوتی ہے جس کو قرآن میں دین کے بدلے دنیا خریدنا بتایا گیا ہے ۔

بدلہ لینا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ (اگر تم بدلہ لو تو اسی کے مثل بدلہ لو جو تمہارے ساتھ کیا گیا ہے، النحل ۱۲۶)

یہاں الفاظ بظاہر عام ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب لینا سراسر غلط ہوگا کہ کوئی شخص آپ کو گالیاں دے تو آپ بھی اس کے جواب میں اس کو اسی طرح گالیاں دینے لگیں۔ یہاں اگرچہ کوئی شرط مذکور نہیں مگر وہ یہاں مفہوم (understood) ہے۔ وہ شرط یہ کہ تم جو بدلہ لو وہ اسلامی اخلاق کے دائرہ میں ہو نہ کہ اس سے باہر۔ معروف اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی ہم اپنے کسی مخالف کا جواب دے سکتے ہیں نہ کہ معروف اسلامی اور اخلاقی حدود کے باہر۔

مثلاً اگر کسی نے ہمارے خلاف نعرہ لگایا ہے تو ہم اس کو پتھر نہیں مار سکتے۔ کسی سے ہم کو اصولی اختلاف ہے تو ہم الزام تراشی کے انداز میں اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ کسی قوم کے ایک فرد نے زیادتی کی ہے تو ہم اس قوم کے دوسرے افراد سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ کسی نے الفاظ کے ذریعہ ہماری دل آزاری کی ہے تو ہم گولی اور بم سے اس کو سزا نہیں دے سکتے۔ کسی نے ہم کو مالی نقصان پہونچایا ہے تو ہم اس کو قتل کر کے اس سے انتقام نہیں لے سکتے۔

اسی کے ساتھ اس کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بدلہ لینے کی بھی ایک حد ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے باہر جا کر کسی سے بدلہ نہیں لے سکتا۔ مثلاً کوئی گالی دے تو وہ اس کو گالی نہیں دے گا۔ کوئی الزام تراشی کرے تو وہ اس کے جواب میں الزام تراشی نہیں کرے گا۔ کوئی شخص کمینہ پن کا انداز اختیار کرے تو وہ اس کے لیے کمینہ نہیں بن جائے گا۔

ایسے مواقع پر مومن کو بدلہ لینے کے بجائے اعراض کرنا ہے۔ مومن اسلامی اخلاق کے دائرہ میں بدلہ لے سکتا ہے۔ اگر معاملہ اسلامی اخلاق کے دائرہ کے باہر کا ہو تو وہ خود صبر کرے گا اور معاملہ کو اللہ کے حوالے کر کے خاموش ہو جائے گا۔

برابر کا بدلہ لینا اسلام میں جائز ہے۔ مگر بدلہ لینا اتنا نازک کام ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کو زیادہ محفوظ طریقہ سمجھے گا کہ بدلہ لینے کے بجائے اسے معاف کر دے۔

معرفتِ قرآن

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضؓ نے ایک روز حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ یہ امت کیسے اختلاف میں پڑجائے گی، حالاں کہ اس کی کتاب ایک ہے، اس کا نبی ایک ہے، اس کا قبلہ ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اے امیرالمومنین، قرآن ہمارے اوپر اتارا گیا۔ ہم نے اس کو پڑھا اور یہ جانا کہ وہ کس چیز کے بارہ میں اترا ہے۔ مگر ہمارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن کو پڑھیں گے لیکن یہ نہ جانیں گے کہ وہ کس چیز کے بارہ میں اترا ہے۔ پس ہر گروہ کی قرآن کے بارہ میں ایک رائے ہوجائے گی۔ اور جب ہر گروہ کی الگ رائے ہوجائے گی تو وہ اختلاف کریں گے۔ اور جب اختلاف کریں گے تو آپس میں قتال کریں گے۔ (حیاۃ الصحابہ، الجزء الثالث، صفحہ ۲۱۸)

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۸۹ کو ہندستان کی نویں لوک سبھا کا الکشن ہوا۔ اس موقع پر الکشنی مہم کے تحت جو کچھ کیا گیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہر طرف اس مضمون کے پوسٹر لگائے گئے کہ "ہاتھ سے ہاتھ ملائیے"۔ اُس وقت پورے ماحول میں جو فضا بنی ہوئی تھی، اس میں ہر شخص نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس کو ووٹ دو، جس کا چناؤ نشان ہاتھ ہے۔

لیکن یہی پوسٹر ایک ہزار برس بعد کچھ لوگوں کو اچانک مل جائے تو اس کا سمجھنا ان کے لیے انتہائی دشوار ہوگا۔ کوئی شخص کہے گا کہ اس کا مطلب مصافحہ کرنا ہے۔ کوئی کہے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دست بدست جنگ کرو۔ کوئی اس کا مطلب یہ بتائے گا کہ سفر میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہو۔ تاکہ کوئی بچھڑنے نہ پائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کو سمجھنے کے لیے نزولِ قرآن کے پس منظر کو جاننا انتہائی ضروری ہے۔ یہ پس منظر سیرتِ رسول کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہو اور اللہ کی رضا کا طالب ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے ذہن کو خالی کرکے قرآن، حدیث، سیرت اور صحابہ کے حالات کو پڑھے اور اسی کے ساتھ ہدایت کی دعا بھی کرتا رہے۔ انشاء اللہ وہ سچائی کے راستہ کو پالے گا۔

بڑا ظرف

لنڈن جانسن (Lyndon B. Johnson) امریکہ کا ۳۶ واں پریسیڈنٹ تھا۔ وہ ۱۹۰۸ میں پیدا ہوا، ۱۹۷۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ امریکہ کو عظیم سماج (Great Society) بنائے۔ اس کے لیے اس نے مختلف اقدامات کیے۔ انھیں میں سے ایک ہجرت (immigration) کے قانون میں تبدیلی بھی ہے۔

جانسن نے سب سے زیادہ اہمیت علم اور تعلیم کو دی۔ اس کا کہنا تھا کہ امریکہ کے مستقبل کے بارہ میں ہماری جو امیدیں ہیں ان میں سب سے زیادہ بنیادی اہمیت علم کو ہے :

Learning is the basic to our hopes for America.

امریکہ بیرونی دماغوں کا استقبال کرتا ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں جانسن سے پہلے ایک رکاوٹ حائل تھی۔ امریکہ میں سفید فام ماہرین کے داخلہ کے لیے نرم قوانین تھے۔ مگر سیاہ فام ماہرین کے داخلہ کے سلسلہ میں سخت قسم کے قواعد وضوابط تھے۔ اس کی وجہ سے امریکہ اپنے ترقیاتی عمل میں سیاہ فام ماہرین کو زیادہ استعمال نہیں کر پاتا تھا۔

لنڈن جانسن نے اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۶۵ میں امریکہ کے قانون ہجرت میں تبدیلی کر دی۔ اس نے سیاہ فام کے داخلہ سے تمام قانونی پابندیاں اٹھالیں۔ اس نے کہا کہ ہمیں لوگوں کی مہارت کی ضرورت ہے، ہمیں ان کے چمڑے کی ضرورت نہیں :

We need their skills and not their skins

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بڑی ترقی حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کی صلاحیت کو دیکھے اور بقیہ تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دے۔ جن کا ذہن دوسرے پہلوؤں میں الجھا رہے وہ کبھی لائق افراد کو اپنے گرد جمع نہیں کر سکتے۔

بڑی کامیابی کے لیے بڑا ظرف درکار ہوتا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ جتنا بڑا ظرف اتنی بڑی کامیابی۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر

ایک خاتون کا خط مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۹۲ ہم کو ملا ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے: بلقیس کوثر، ۱-۳-۲۲ کسان نگر، بھونگیر ۵۰۸۱۱۶ (ضلع نلگنڈا) انھوں نے اپنے یہاں کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ انھیں کے اپنے لفظوں میں یہ ہے:

"ہمارے یہاں کے ایک صاحب جو اسکوٹر پر اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں تین لڑکے جو ہمارے محلہ ہی کے تھے، جن میں دو مسلم تھے اور ایک ہندو، وہ بھی سڑک پر جا رہے تھے۔ اچانک اسکوٹر ان سے ٹکرا گیا اور وہ صاحب اسکوٹر سے گر پڑے۔ غصہ میں آکر انھوں نے اس لڑکے کو جو ہندو تھا، ایک تھپڑ مارا، اور پھر اپنے گھر چلے گئے۔ اس کے بعد وہ کار میں بیٹھے اور سیدھا پولس اسٹیشن جانے کے لیے نکل پڑے۔ ہمارے ابا جان نے ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ میں پولس اسٹیشن پر رپورٹ لکھوانے جا رہا ہوں۔ اگر میں خاموش ہو گیا تو یہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ابا جان نے منع کیا اور کہا کہ ایسے واقعات کی رپورٹ پولس اسٹیشن میں نہیں لکھوانا چاہیے۔ کیوں کہ اس سے بات بڑھ جائے گی اور مار پیٹ شروع ہو کر فساد کی نوبت آجائے گی۔ پہلے وہ صاحب نہیں مان رہے تھے۔ جب ۱۵-۲۰ منٹ تک ان سے کہا کہ آئندہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ اپنے محلہ کے لڑکے ہیں، وغیرہ تو آخر کار وہ صاحب مان گئے۔ اس طرح ایک بڑا جھگڑا ہونے سے رک گیا۔"

یہ واقعہ اس عمل کی ایک مثال ہے جس کو شریعت میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہی ہے کہ ماحول کے اندر جب مذکورہ قسم کے حالات پیدا ہوں تو ایک یا چند افراد فوراً اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ وہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کریں۔ وہ ان کو منصفانہ عمل کی تلقین کریں۔ وہ ان کو ایسے اقدامات سے روکیں جن کا نتیجہ جان و مال کی تباہی کی صورت میں نکلنے والا ہو۔

یہی فسادات کا واحد چیک ہے۔ اگر ہر مقام پر یہ عمل جاری ہو جائے تو یقینی طور پر تمام فرقہ وارانہ یا غیر فرقہ وارانہ فساد کی جڑ کٹ جائے۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اسی قسم کا ایک سماجی اور اصلاحی عمل ہے، وہ سیاسی لیڈری کا کوئی عنوان نہیں۔

کامیابی کا راز

ٹاٹا خاندان نے صنعت کے میدان میں ہندستان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ان کا صنعتی پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو ٹاٹا انڈسٹریل ایمپائر کہا جاتا ہے۔ یہ ترقی انھیں اتفاقاً حاصل نہیں ہوگئی۔ بلکہ اس کے معلوم اسباب ہیں۔ ان اسباب میں نمایاں ترین وہ اخلاقی اوصاف ہیں جس کا ثبوت وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے دے رہے ہیں۔

۱۔ صنعتی کامیابی کی یہ کہانی گجرات کے ایک پارسی جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا سے شروع ہوتی ہے۔ انھوں نے ۱۸۶۸ میں بمبئی میں ۲۱ ہزار روپیہ کی لاگت سے اسٹیل کا ایک کارخانہ ٹاٹا پلانٹ کے نام سے قائم کیا۔ یہ ابتدا ترقی کرتے کرتے آج ایک انڈسٹریل ایمپائر بن چکی ہے۔ مگر ٹاٹا گروپ پورے استقلال اور اتحاد کے ساتھ اپنی مہم میں لگا ہوا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کے استقلال اور اتحاد کو توڑنے والی نہ بن سکی۔

۲۔ جمشید جی کے بعد ان کے صاحبزادے جہانگیر رتن جی دادا بھائی ٹاٹا (JRD Tata) نے اس کاروبار کو بہت زیادہ ترقی دی ہے۔ ان کو بجا طور پر عظیم بصیرت والا انسان (great visionary) کہا جاتا ہے۔ ان کی بصیرت اور دور اندیشی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ہندستان میں ہوا بازی کی اہمیت کو سمجھا۔ وہ پہلے ہندستانی پائلٹ ہیں جن کو مارچ ۱۹۲۹ میں ہوائی جہاز چلانے کا لائسنس دیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۳۲ میں پہلی ہوائی کمپنی ٹاٹا ایرویز کے نام سے قائم کی۔ ۱۹۴۸ میں ہندستانی حکومت نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اس کا نام ایر انڈیا رکھ دیا گیا۔

۳۔ جے آر ڈی ٹاٹا (۱۹۰۴) غیر معمولی وسعت ظرف کے مالک ہیں۔ ۱۹۳۰ میں آغا خاں نے اعلان کیا کہ انگلینڈ اور انڈیا کے درمیان جو شخص سب سے کم وقت میں جہاز اڑا کر لے جائے گا اس کو وہ بہت بڑا انعام دیں گے۔ اس پر جے آر ڈی ٹاٹا نے کراچی سے اپنا جہاز اڑایا۔ ایک اور شخص لندن سے روانہ ہوا۔ درمیان میں دونوں تیل لینے کے لیے قاہرہ میں اترے۔

اس وقت ٹاٹا کو معلوم ہوا کہ ان کے حریف کو ایک پرزہ کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اس کو اس وقت تک قاہرہ ایرپورٹ پر انتظار کرنا پڑے گا جب تک انگلینڈ سے وہ پرزہ نہ آجائے۔ ٹاٹا کے لیے یہ سنہری موقع تھا کہ وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کر لیں۔ مگر انھوں نے وسعت ظرف سے کام لیتے ہوئے

وہ پرزہ اپنے پاس سے اپنے حریف کو دے دیا۔ اس فیاضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا حریف مقابلہ جیت گیا۔ مگر ٹاٹا نے کبھی اس کے بارہ میں کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا۔

۴۔ انسانی احترام کے بارہ میں جے آر ڈی ٹاٹا بے حد حساس ہیں۔ اختیارات کے باوجود وہ اپنی رائے دوسروں کے اوپر نہیں تھوپتے۔ بلکہ ہمیشہ دوسروں کو متاثر کرنے کا طریقہ (persuasion therapy) استعمال کرتے ہیں۔ ایک بار ان کی کمپنی کے ایک ڈائرکٹر نے ایک لفٹ پر یہ نوٹس لگا دی کہ اس لفٹ کو صرف ڈائرکٹر حضرات ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ ٹاٹا کو معلوم ہوا تو وہ تیزی سے مذکورہ مقام پر پہنچے اور خود اپنے ہاتھ سے اس نوٹس کو پھاڑ کر پھینک دیا (ہندستان ٹائمس ۳ فروری ۱۹۹۲)

اس دنیا میں کامیابی کا راز، ایک لفظ میں، با اصول ہونا ہے۔ یہاں اصول کے مطابق زندگی گزارنے والا آدمی کامیاب ہوتا ہے اور اصول سے انحراف کرنے والا آدمی ناکام۔

اصول کیا ہے۔ اصول دراصل حقائق سے مطابقت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ حقائق اگر استقلال کا تقاضا کریں تو آدمی غیر مستقل مزاجی کے ساتھ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حقائق اگر دور اندیشی آدمی کا ساتھ دیتے ہوں تو دور اندیشی کے خلاف رویہ کا ثبوت دے کر یہاں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ حقائق کا مطالبہ اگر یہ ہو کہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کی جائے تو یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص لوگوں کے مزاج کے خلاف چلے اور اس کے باوجود وہ کامیاب ہو۔

نیز یہ کہ اصول کو مفادات سے بلند ہو کر اختیار کرنا چاہیے۔ اگر ایک شخص ایسا کرے کہ جہاں بظاہر فائدہ نظر آئے وہاں وہ اصول پسند بن جائے اور جہاں فائدہ دکھائی نہ دے وہاں وہ اصول کو چھوڑ دے تو ایسے شخص کو با اصول نہیں کہا جا سکتا۔

جو شخص اصول کو مفادات کے تابع رکھے وہ اس دنیا میں چھوٹی کامیابی تو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر یہاں بڑی کامیابی صرف اس انسان کے لیے مقدر ہے جو اصول کو اصول کے لیے اختیار کرے، جو مفادات کی پروا کیے بغیر اصول پر قائم رہنے والا ہو۔

ایک پیغام

ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر مسٹر ایچ کے دوا نے ۷ جون ۱۹۹۲ کو وزیر اعظم ہند نرسمہاراؤ کا ایک انٹرویو لیا۔ یہ خصوصی انٹرویو نئی دہلی میں وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ۷، ریس کورس روڈ) پر ریکارڈ کیا گیا۔ وہ ۹۰ منٹ تک جاری رہا۔ یہ انٹرویو ہندستان ٹائمس کے شمارہ ۸ جون ۱۹۹۲ میں نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔

اس انٹرویو میں دوسرے سوالات کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ بھی زیر گفتگو آیا۔ مسٹر نرسمہاراؤ نے بی جے پی کے اس مطالبہ کو رد کر دیا کہ دستور ہند سے دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کشمیری جنگجوؤں کے مطالبۂ آزادی (انڈپنڈنس) کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا۔ تاہم مسٹر دوا کا کہنا ہے کہ وزیر اعظم کامل آزادی کے مطالبہ کو رد کرتے ہوئے داخلی خود مختاری (اٹونومی) کے معاملہ میں کسی قدر نرم تھے۔

The Prime Minister's answers to questions about how his Government planned to tackle the Kashmir question were significant. Mr Narasimha Rao favoured the restoration of representative Government in Jammu and Kashmir as soon as the conditions permitted on the ground that too long a spell of President's rule would be counterproductive. He rejected the militants' demand for independence for Kashmir, maintaining that any solution for the question has to be found within the framework of the Indian Constitution. The Prime Minister also rejected the BJP's demand for scrapping Article 370 of the Constitution. After rejecting "Azadi" on the one hand and the repeal of the Article 370, the Prime Minister sounded somewhat flexible about discussing the quantum of autonomy for Kashmir—of course, within the framework of the Indian Constitution. This is what the Prime Minister said :

"Within the Indian Constitution, there are so many views as you can see. Outside the Indian Constitution, that is something which we don't want to look at. When someone calls it Azadi and means that he doesn't want the Indian Constitution to operate, then we have no common ground. If he thinks that within the Indian Constitution an amount of autonomy which meets with their aspirations is possible, then that is what we have to explore. So, it is within that area that all these differing opinions are possible, starting from one extreme opinion that Article 370 itself should be scrapped all the way to another opinion which seeks more powers for the State etc.etc. So, you can see that it is a very wide area and within that wide area whatever we consider feasible and whatever is considered good for the State, that would have to be determined. And that can be only after the long, thorough and deep examination."

—*The Hindustan Times*, June 8, 1992.

وزیر اعظم نے کہا کہ دستورِ ہند کے باہر تو اس مسئلہ پر کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ مگر دستورِ ہند کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کے حل کی کئی صورتیں قابل عمل ہیں۔ جب کوئی شخص آزادی کا لفظ بولے اور اس کی مراد یہ ہو کہ وہ دستورِ ہند کی ماتحتی نہیں چاہتا تو اس وقت ہمارے درمیان کوئی مشترک بنیاد باقی نہیں رہتی۔ البتہ اگر آدمی خیال کرے کہ دستورِ ہند کے اندر ایسی خود اختیاری کا حصول ممکن ہے جو اس کی آرزوؤں کو پورا کرسکتا ہے تو یہ وہ چیز ہے جس پر ہمیں گفت وشنید کرنا چاہیے۔

ہندستان ٹائمس (۹ رجون ۱۹۹۲) نے اپنے اداریہ میں وزیر اعظم ہند کی اس تجویز کو بجا طور پر نہایت تعمیری تجویز (most concrete) کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات کے اعتبار سے یہ کشمیریوں کے لیے "بسٹ پاسبل" کے ہم معنی ہے۔ اور انھیں مزید وقت کھوئے بغیر اس کو اختیار کرلینا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ وہ اٹونومی کی بنیاد پر نئی دہلی سے گفتگو شروع کردیں۔ وہ دل سے وزیر اعظم کی اس پیش کش کو قبول کرلیں۔

خدا کی اس دنیا میں زندگی کے فیصلے بندوق کے زور پر نہیں ہوتے، بلکہ حقائق کے زور پر ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، قانونِ حیات کی پیروی کے ذریعہ ملتا ہے۔ یہ قانونِ حیات خود خالق کائنات کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اور کون ہے جو خالق کائنات کے نقشہ کے خلاف چل کر اپنے لیے کوئی چیز پاسکے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ اس دنیا میں زیادہ کا مطالبہ کرے مگر وہ کم پر راضی ہوجائے۔ وہ ناممکن کے پیچھے نہ دوڑے بلکہ ممکن کو اپنا نشانہ قرار دے۔ وہ مسائل سے ٹکرانے کے بجائے مواقع کو استعمال کرے۔ وہ کسی بھی حال میں کسی معاملہ کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے۔ وہ تشدد کی قوت سے پرہیز کرے اور ہر حال میں امن کی قوت کو استعمال کرے۔ وہ آگے بڑھنے کے ساتھ پیچھے ہٹنا بھی جانتا ہو۔

کشمیریوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ موجودہ حالات میں ان کے لیے انتخاب ہندستانی کشمیر اور غیر ہندستانی کشمیر میں نہیں ہے۔ بلکہ ہندستانی کشمیر اور برباد کشمیر میں ہے۔ پچھلے تین سال کا تجربہ اس حقیقت کو کامل طور پر ثابت کرچکا ہے۔ اب آخری طور پر وہ وقت آگیا ہے کہ کشمیری اپنے رویہ پر نظرِ ثانی کریں۔ وہ دوڑتے ہوئے وقت کو مزید ایک لمحہ کے لیے بھی ضائع نہ کریں۔

ایک غلطی

ایک انگریزی میگزین میں ایک لطیفہ نظر سے گزرا۔ پال نام کا ایک بچہ اپنے باپ کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں اس نے مختلف قسم کے جانور دیکھے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میرے لیے ایک جانور خرید دیجئے۔ باپ نے کہا کہ اس کا کھانا ہم کہاں سے لائیں گے۔ بچہ نے جواب دیا کہ ان جانوروں میں سے ایک خرید دیجئے جن کے پنجرہ پر لکھا ہوا تھا کہ کھلانا نہیں ہے :

Paul went to the zoo with his father, "Buy an animal for me," he begged. "Where would we get his food ? asked the father. The boy replied, "Buy one of those where it says on the cage : 'No feeding.'

بچہ کی غلطی کیا تھی۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ پنجرہ کے بورڈ پر جو بات زائرین کی نسبت سے لکھی ہوئی تھی، اس نے اس کو خود جانوروں کی نسبت سے سمجھ لیا۔ اس واقعہ میں یہ ایک نادان بچہ کا کلمہ تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ بہت سے بڑے لوگ بھی اسی نادانی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

۳۰ سال پہلے ایک مسلم دانشور نے "اسلامی اشتراکیت" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ ان الارض للہ (زمین اللہ کی ہے) انھوں نے لکھا کہ زمین اللہ کی ہے، پھر وہ کسی انسان کی ملکیت کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ دلیل مذکورہ قسم کی نادانی پر قائم تھی۔ اللہ کے مقابلہ میں بلاشبہ زمین کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا۔ مگر انسان اور انسان کے مقابلہ میں ہر ایک کے مالکانہ حقوق ہیں جو خود شریعتِ الٰہی نے مقرر کیے ہیں۔ آیت میں جو بات خدا کی نسبت سے تھی اس کو مسلم دانشور نے انسان کی نسبت سے سمجھ لیا۔

یہ غلطی بہت زیادہ عام ہے۔ موجودہ دنیا میں بیشتر غلطیاں اور گمراہیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ ایک بات جس پہلو سے کہی گئی ہے اس کو وہاں سے ہٹا کر کسی اور پہلو سے جوڑ لیا جاتا ہے۔ اگر بات کو اس کے اصل مدعا پر رکھ کر اسے سمجھا جائے تو اکثر غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی جڑ کٹ جائے۔

ہر بات کسی خاص مفہوم میں کہی جاتی ہے۔ اگر بات کو اس کے مخصوص مفہوم سے الگ کر دیا جائے تو بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ حتی کہ خدا اور رسول کا کلام بھی۔

تجربہ کی زبان سے

ایک پاکستانی مسلمان اپنے ہندستانی عزیزوں سے ملنے کے لئے ہندستان آتے رہتے ہیں۔ ان کا ہندستان کا پتہ یہ ہے : آغا غیاث الرحمٰن انجم، جان سنز کارپٹ مینوفیکچررز، کمرشل اسٹریٹ، بنگلور۔ موصوف کا تفصیلی خط ہمیں موصول ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنا تین واقعہ درج کیا ہے۔ ان کے خط کا ابتدائی حصہ خود انھیں کے اپنے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے۔

میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ اپنے عزیزوں سے ملنے میں اکثر بنگلور آتا رہتا ہوں۔ اب کے بار انڈیا آیا تو الرسالہ کا شمارہ جنوری ۱۹۹۲ء دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں ایک واقعہ افضل صاحب کا "خون کے بجائے پانی" کے عنوان سے پڑھا تو میرے ذہن میں انڈیا کے تعلق سے تین ذاتی واقعات آگئے۔ جو اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں۔ ان واقعات سے میرا یہ یقین پختہ ہوگیا ہے کہ دل میں اگر تنگی اور نفرت کے بجائے دوسروں کے لئے محبت اور کشادگی ہو۔ رویے میں سختی کے بجائے نرمی اور زبان پر تلخی کے بجائے مٹھاس ہو تو پوری دنیا امن و آشتی سے مالا مال ہو سکتی ہے۔

پہلا واقعہ ۱۹۸۲ میں پیش آیا۔ میں، میری بیوی، بیٹی اور نوعمر بیٹا بذریعہ ٹرین دہلی سے بنگلور جا رہے تھے۔ جس بوگی میں ہمیں جگہ ملی وہ چھوٹی سی تھی۔ اور اس میں تقریباً پندرہ مسافر اور تھے جن کا تعلق بھارت اور ہندو مت کے ساتھ تھا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے جو بنگلور کے کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اور چھٹیاں گزارنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔ ہماری روایتی سادگی اور بے تکلفی کے سبب یہ نوجوان بہت جلد ہم سے گھل مل گئے۔ میری ڈاڑھی اور میرے پریوار کی نمازوں کی پابندی دیکھ کر ہمارے بارے میں ان کا تاثر یہ تھا کہ ہم مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ دنیا کے موسم و حالات اور علاقائی سیاست سے چلتے چلتے مذہبی معاملات پر بھی ہونے لگی۔ ان میں ایک ہندو نوجوان بات کرنے میں پیش پیش تھا۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ ذہین نوجوان ہے اور اپنے مذہب کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا ہے۔ بہت سے سوالات اور جوابات کے بعد مذکورہ نوجوان نے ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب پر بوگی کی پوری فضا یکسر بدل گئی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب مختلف نہیں بلکہ ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہمارے

یہاں دوری اور دوئی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔

سوال یہ تھا کہ "ہمارے کرشن جی مہاراج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے جواب دیا کہ میں آپ کو ایک اصول بتاتا ہوں۔ قرآن مجید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق "کسی مسلمان کو نہ حق ہے اور نہ اجازت ہے کہ وہ کسی مذہب کے پیشواؤں اور قائدوں کو برا بھلا کہیں۔" بلکہ حکم ہے کہ ہم ہر عقیدے اور دھرم کے پیشواؤں کا اور بزرگوں کا احترام کریں۔ لہٰذا اس قانون کی رو سے ہم اس بات کے پابند ہیں "کہ شری کرشن جی مہاراج اور دیگر مذاہب کے تمام پیشواؤں کا احترام کریں اور ان کی تعظیم کریں۔"

یہ سننا تھا کہ نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

"اگر دنیا کے تمام مذہبی لوگ ایسے ہو جائیں جیسے آپ ہیں تو یہ لڑائی جھگڑے، قتل و غارت گری اور آئے دن کے فسادات ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔"

میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اگر یہ بات ہے تو آپ سب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ تم اپنی پوری زندگی میں لوگوں کے دلوں سے کدورتیں اور دشمنیاں مٹاؤ گے۔ اور ان کے دلوں میں باہمی صلح و محبت اور افہام و تفہیم کے بیج بوؤ گے۔ تمام نوجوانوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا۔

اس طویل سفر کے دوران ساری گفتگو کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ہم کو بنگلور کینٹ کے اسٹیشن پر اترنا تھا اور ان کو بنگلور سٹی کے اسٹیشن پر۔ لہٰذا ہماری منزل پہلے آگئی۔ جوں ہی گاڑی اسٹیشن پر رکی تو ان نوجوانوں نے نہ تو کسی قلی کو ہمارے سامان کے قریب آنے دیا۔ اور نہ ہمیں ہمارے سامان کو ہاتھ لگانے دیا۔ بلکہ ہر نوجوان نے آگے بڑھ کر از خود قلیوں کی طرح ہمارا سامان اپنے ہاتھوں اور کندھوں پر اٹھایا۔ اور آن واحد میں پورا سامان پلیٹ فارم پر ڈھیر کر دیا۔ اور جب گاڑی چلی تو ایک ایک نوجوان نے ہم کو سلام کیا، معانقہ کیا، ہمارے عزیزوں کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اپنے ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے گاڑی پر سوار ہوئے۔ اور اس سفر کی خوشگوار یادیں ہمارے دلوں میں چھوڑ کر جانب منزل روانہ ہو گئے۔

اصلاح کا طریقہ

بنو امیہ کے زمانہ میں خلافت اپنے اسلامی طرز پر باقی نہ رہی۔ اب انصاف کی جگہ ظلم ہونے لگا اور سرکاری اموال میں دیانت کے بجائے اسراف شروع ہوگیا۔ اس زمانہ میں کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ایسے حکمرانوں کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔ مگر اس وقت اصحاب رسول میں سے جو لوگ موجود تھے انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انھیں موجودہ حکمرانوں کو دی جائے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کس کو دیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ وقت کے حاکموں کو دو۔ پوچھنے والے نے کہا کہ یہ لوگ زکوٰۃ کی رقم عطر پر اور اپنے قیمتی کپڑوں پر خرچ کرتے ہیں۔ جواب دیا: وَاِنْ۔ یعنی اگرچہ وہ ایسا کریں تب بھی انھیں کو دو (ابن ابی شیبہ)

صحابی رسول کی یہ ہدایت عین اسلامی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس ہدایت کا مطلب ظالم حکمراں کے سامنے جھکنا نہیں تھا، بلکہ لوگوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے عمل کا رخ کیا ہونا چاہیے۔

حکمراں کا بگاڑ ہمیشہ عوام کے بگاڑ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے (کما تکونون کذلک یؤمر علیکم) ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب حکمراں میں بگاڑ نظر آئے تو عوام کی سطح پر اصلاح کا کام شروع کر دیا جائے۔ درخت کے اندر اگر سوکھنے کے آثار ظاہر ہوں تو اس کی جڑ میں پانی دیا جائے گا نہ کہ پتیوں میں۔

حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے جواب کے ذریعہ لوگوں کے سوچنے کے رخ کو موڑ دیا۔ لوگ حکمراں میں بگاڑ دیکھ کر سوچنے لگے تھے کہ حکمراں سے لڑیں۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ تم لوگ اپنی سوچ کو سیاست کے باہر دوسرے دائروں میں اصلاح پر لگاؤ۔ غیر سیاسی دائرہ میں اگر تم اصلاح لانے میں کامیاب ہوگئے تو اس کے بعد سیاسی دائرہ میں بھی لازماً اصلاح ہو کر رہے گی۔

سیاست میں بگاڑ کو دیکھ کر سیاسی نظام سے لڑنے لگنا صرف ایک عاجلانہ ردعمل ہے، قوت کے ضیاع کے سوا اس کا کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔ اس لیے اسلام میں ایسی کارروائیوں سے منع کیا گیا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بگاڑ کی جڑ کو سمجھا جائے اور جڑ سے اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اور جڑ والی اصلاح کا آغاز عوامی اصلاح سے ہوتا ہے نہ کہ حکومتی ٹکراؤ سے۔

قومی بیداری

یونان کا ایک قدیم شہر ہے جس کا نام سالونیکا ہے۔ اس کا دوسرا نام تھیسالونیکا ہے۔ ۱۹۱۲ تک یہاں ترکوں کی حکومت تھی جو پہلی عالمی جنگ میں ترکوں کی شکست کے بعد ختم ہوگئی۔

یہ یونانی شہر ۳۱۵ ق م میں باقاعدہ طور پر آباد کیا گیا۔ موجودہ انجیل میں سینٹ پال کے جو خطوط ہیں ان میں سے دو خط یہاں کے ان مسیحیوں کے نام ہیں جنھوں نے ابتداءً مسیحی مذہب قبول کیا تھا۔ یہاں یہودی تقریباً پچاس ہزار کی تعداد میں آباد تھے۔ مگر ۱۹۴۳ میں نازیوں نے ان میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا۔ نیز اس مقام پر جتنے یہودی آثار تھے ان کو بھی مٹا دیا۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۴ دسمبر ۱۹۸۳) میں بتایا گیا تھا کہ اب یہاں کی بقیہ یہودی آبادی نے اپنی تنظیم قائم کی ہے جس کا نام یہ ہے:

Alliance Israelite Universelle

اس تنظیم کے صدر لیون بن میور (Leon Ben Mayor) سے پوچھا گیا کہ یہودیت نے یہاں کیا چیزیں کھوئی ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ تقریباً ہر چیز (Almost everything) انھوں نے مزید کہا کہ یہ صرف مصیبت کے لمحات ہیں جب کہ ہمارے نوجوان لوگ اپنے کو یہودی محسوس کرتے ہیں:

It is only in moments of peril that the younger people feel (themselves) Jewish.

یہ بات جو یہودی عالم نے یہودیوں کے بارہ میں کہی، وہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم نوجوانوں میں، ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کے الفاظ میں، اسلام زندہ ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ اس کو صحوہ اسلامیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ محض قومی مصیبت کی زمین پر ابھرنے والا اسلام ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں خدا کی معرفت کی زمین پر ابھرنے والا اسلام۔

قرآن (۴۱/۵۱) کے مطابق اس قسم کی مذہبیت معتبر نہیں۔ حقیقی مذہبیت وہ ہے جو معرفتِ خداوندی کی بنیاد پر ابھرے نہ کہ مصیبت قومی کی بنیاد پر۔ جس کا سرچشمہ حقیقت اعلیٰ کی دریافت ہو نہ کہ مادی مسائل میں مبتلا ہونا۔

تزکیہ کیا ہے

تزکیہ کا مقصد کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے تو الفاظ کے فرق کے ساتھ تقریباً سب کا جواب ایک ہوگا۔ یعنی روح کو پاک کر کے اس کو اس قابل بنانا کہ وہ خدا کی قربت حاصل کر سکے۔ اس کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ تزکیہ کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے۔ تو بیشتر لوگ یہ جواب دیں گے کہ اس کی تدبیر ہے کسی شیخ (ولی) کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا۔ مگر پہلا جواب جتنا صحیح ہے، دوسرا جواب اتنا ہی غلط ہے۔

تزکیہ بلاشبہہ ایک قرآنی مطلوب ہے۔ بلکہ تزکیہ ہی پر آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے (ذٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكّٰى) مگر تزکیہ کے عمل کا شیخ یا ولی سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شیخ یا ولی کسی آدمی کا تزکیہ نہیں کر سکتا۔ تزکیہ صرف اپنی ذاتی محنت اور اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں، اور نہ کوئی شخص تصرف کے ذریعہ کسی کو تزکیہ کے مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

تزکیہ کا ذریعہ حقیقۃً یہ ہے کہ روح کو خوراک پہنچائی جائے۔ جسم کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جسم کو پہنچائی جائے تو جسم صحت مند ہو جائے گا۔ اسی طرح روح کی ایک خوراک ہے۔ یہ خوراک جب روح کو پہنچائی جاتی ہے تو روح صحت مندی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے جس کو مصفّیٰ اور مزکّیٰ کہا جاتا ہے۔

روح کی یہ خوراک تفکیر (آل عمران ۱۹۱) ہے۔ آدمی کے گرد و پیش ہر وقت کچھ واقعات پیش آرہے ہیں۔ سماجی، تاریخی، کائناتی، ہر سطح پر ہر آن ان کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ان واقعات سے عبرت اور نصیحت لینا ہی روح کی خوراک ہے۔ جو شخص اپنے شعور کو اتنا ترقی دے کہ اس کو گرد و پیش کے واقعات میں خدائی کرشمے دکھائی دیں، جو اس کے لیے خدا کو یاد دلانے کا ذریعہ بن جائیں، تو ایسے شخص نے اپنی روح کے لیے رزق ربانی کا ایک دسترخوان حاصل کر لیا۔ اس کی روح اس دسترخوان سے اپنی صحت مندی کی خوراک لیتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

تزکیہ کا اہم ترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے اندر عبرت پذیری کے مزاج کو جگایا جائے۔ عبرت پذیری گویا تزکیہ کی زمین ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس پر تزکیہ کی فصل اگتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کو اگانا ایسا ہی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر ایک ہرا بھرا درخت اگانے کی کوشش کی جائے۔

تزکیہ کا ذریعہ رزق رب ہے نہ کہ رزق شیخ۔

مالٹا ہوٹل کے ایک دروازہ پر لکھا ہوا تھا: معذوروں کے لئے حمام (Handicap toilets)

مغربی دنیا میں معذوروں کے لئے خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کو ہر جگہ خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر دل میں یہ احساس ابھرا کہ خدایا، میں بھی عالم انسانی کا ایک معذور شخص ہوں۔ تو میرے ساتھ میرے عمل کے اعتبار سے نہیں بلکہ میرے عذر کے اعتبار سے معاملہ فرما۔ اپنی رحمت خاص سے میری بخشش فرمادے۔

مالٹا کا مسلم عہد مسلمانوں کے دور عروج میں تھا۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز پر مسلم تہذیب کی گہری چھاپ اب تک موجود ہے۔ یہاں کے مکانات بیشتر مسلم اسپین کے طرز پر بنائے گئے ہیں۔ مقامات کے نام ابھی تک عربی میں ہیں۔ مثلاً غار، رباط، سلیمہ، مدینہ وغیرہ۔ مگر قومی اسباب سے مسلمانوں کے خلاف تعصب پایا جاتا ہے۔ مثلاً سیاحوں کے لئے تیار کئے ہوئے ایک پمفلٹ میں نپولین کے ذیل میں "مالٹا میں نپولین کے دستوں کی آمد" کا لفظ ہے، اور ترکوں کے ذیل میں "ترک فوجوں کا مالٹا پر حملہ" کا لفظ درج کیا گیا ہے:

MARSAXLOKK: The Turkish forces invaded Malta in 1565 from the shores of this village. Here also landed the troops of Napoleon to whom the knights surrendered in 1798.

یہ انسان کا عام مزاج ہے کہ وہ اپنوں کے لئے ایک قسم کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور غیروں کے لئے دوسرے قسم کے الفاظ۔ تاہم اس کو پڑھ کر مجھے لکھنے والوں پر کوئی غصہ نہیں آیا۔ کیوں کہ یہ بات موجودہ مسلمانوں میں مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ آج مسلمانوں کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ ان کو جس شخص یا جس گروہ سے شکایت ہو جائے اس کے لئے ان کی زبان بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔

مالٹا جیسے چھوٹے اور دور دراز مقامات تاریخ کے اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب کہ دنیا میں عام طور پر مذہبی جبر کا دور دورہ تھا۔ لوگ حکومتوں کے مذہبی تشدد سے بچنے کے لئے اس طرح کے مقامات پر پناہ لیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مسیحی بزرگ نے رومی پکڑ دھکڑ سے بچنے کے لئے مالٹا میں پناہ لی تھی۔ مالٹا کے بارہ میں ایک تعارفی پمفلٹ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ یہ چرچ ابتداءً ۱۴۱۷ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۶۹۴ میں وہ دوبارہ بنایا گیا۔ یہ چرچ سینٹ اگاتھا سے منسوب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ رومی شہنشاہ ڈیسیس کی تعذیب سے بھاگ کر مالٹا آئے تھے:

CHAPEL OF ST. AGATHA: This church was originally built in 1417, and redesigned by Lorenzo Gafa, in 1694. The church is dedicated to St. Agatha who, it is said, found shelter on Malta from the persecution of the Roman Emperor Decius (249 AD)

مذہبی جبر کے اس دور کو اسلام نے ختم کیا۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ عطیہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر معطی کا اعتراف کرنے والا کوئی نہیں۔ حتی کہ خود مسلمانوں میں بہت سے لوگ اس خدائی واقعہ کو اپنے قومی فخر کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ صحیح یہ تھا کہ اس کو وہ شکر خداوندی کے خانہ میں ڈالیں۔

عرب تہذیب کا اثر مالٹا پر اتنا گہرا پڑا کہ آج بھی وہ مالطی زبان کی صورت میں موجود ہے۔ مالطی زبان حقیقۃً عربی کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس میں انگریزی اور اطالوی زبانوں کے کچھ الفاظ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ موجودہ مالطی زبان انگریزی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

مثال کے طور پر مالطی زبان کا ایک اخبار (Nazzjon) ہے۔ اس کے شمارہ ۲۸ اکتوبر کی پہلی سرخی مذکورہ کانفرنس کے بارہ میں تھی۔ اس کے الفاظ اس طرح تھے:

Il-lum tibda Il-Hames Laqgha Internazzjonali

(الیوم تبدأ الخمیس لقاء انٹرنیشنل) یعنی آج ۵ بجے انٹرنیشنل اجتماع شروع ہوگا۔

ہندستان کے علماء نے ۱۸۵۷ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تحریک شروع کی تھی جو اپنے آخری مرحلہ میں ریشمی رومال کی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس سلسلہ میں دسمبر ۱۹۱۶ میں مولانا محمود حسن صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں ساڑھے تین سال تک مالٹا میں نظر بند رکھا گیا۔ جون ۱۹۲۰ میں وہ رہا کئے گئے۔ اس نظر بندی کے زمانہ میں مولانا موصوف کے شاگرد خاص مولانا حسین احمد مدنی بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس سلسلہ میں جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے:

"حضرت شیخ الہند کے زمانہ نظر بندی میں جو لوگ ساتھ رہے ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے حضرت شیخ کی خدمت کرنے اور زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے میں دن رات ایک کر دیا۔ ایک ادنی سا واقعہ ہے۔ مالٹا میں شدت کی سردی میں حضرت

شیخ کے سرد پانی سے وضو کرنے کی تکلیف آپ سے دیکھی نہ گئی۔ تو آپ نے گرم پانی مہیا کرنے کا انتظام اور التزام اس طرح کیا کہ ساری رات ٹھنڈے پانی کا لوٹا سینے سے لگائے لحاف اوڑھے بیٹھے رہتے اور جسم کی حرارت سے گرم شدہ پانی کا لوٹا فجر کے وضو کے لئے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ یہ سلسلہ ایک یا دو دن نہیں پورے تین سال ۵ مہینے تک چلا۔" (الجمعیۃ ویکلی ۹ - ۱۵ اگست ۱۹۹۱)

اس واقعہ کو ماننے کے لئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پورے تین سال ۵ مہینے تک مالٹا میں متواتر شدت کی سردی پڑتی رہی۔ عام قاعدہ کے خلاف وہاں موسم تبدیل نہیں ہوا۔ اس سے قطع نظر، خود یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مولانا کا ایک شاگرد ان کے پاس ساری رات بیٹھے رہنے کی مصیبت اٹھا رہا ہے مگر مولانا اس کو منع نہیں فرماتے۔ اگر مولانا نے جانتے ہوئے منع نہیں کیا تو یہ ان کی شرافت کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مولانا کو اس کا علم نہ ہو سکا تو یہ اور بھی زیادہ عجیب ہے۔ کیوں کہ جو شخص خود اپنے گھر کے ایک واقعہ سے ساڑھے تین سال تک بے خبر رہے، وہ ان عالمی حالات سے کیوں کر باخبر ہو سکتا ہے جن کو جاننا برٹش امپائر کے خلاف تحریک چلانے کے لئے ضروری تھا۔ ایک صورت میں مولانا کی شرافت مشتبہ ہوتی ہے اور دوسری صورت میں مولانا کی فراست۔ اب یہ مولانا کے معتقدین کو فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

سفر سے پہلے میں نے ایک کتاب حاصل کی۔ اس کا نام "اسیران مالٹا" ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مالٹا کے مذکورہ اسیروں کے بارہ میں تاریخی معلومات ہوں گی اور وہ مالٹا میں میرے کام آئیں گی۔ مگر کتاب کو پڑھنے کے بعد حیرت انگیز طور پر میں نے پایا کہ اس میں دوسری دوسری باتیں تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ مگر اسیران مالٹا کے بارہ میں کچھ نہیں۔ اگرچہ دوسری باتیں بھی اس میں زیادہ تر غیر تاریخی انداز میں ہیں۔ مگر اسیران مالٹا کے بارہ میں جزئی تذکرہ کے سوا کوئی بھی تاریخی یا غیر تاریخی معلومات اس کتاب میں مشکل سے ملے گی۔

اردو کتابوں کا عام طور پر یہی حال ہے۔ اردو زبان کا ارتقاء اس زمانہ میں واجب کہ مسلم اہل قلم اور مسلم اہل زبان سب کے سب زوال کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب ملے گی جو حقیقی معنوں میں سائنٹفک انداز میں لکھی گئی ہو۔ جو لوگ صرف اردو کتابیں پڑھیں وہ علم سے اسی طرح بے بہرہ رہتے ہیں جس طرح دیوان غالب کو پڑھنے والا

آدمی ارضیات سے۔

مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا حسین احمد مدنی کو گرفتاری کے بعد مالٹا لایا گیا تھا اور ساڑھے تین سال تک ان کو یہاں رکھا گیا۔ ان پر انگریز کے خلاف باغیانہ سازش کا الزام تھا۔ ذاتی طور پر مجھے اس واقعہ سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک یہ محض ایک سیاسی واقعہ تھا نہ کہ کوئی اسلامی واقعہ۔ تاہم وہ ہماری تاریخ کا ایک جزء ہے۔ اس بنا پر مجھے تلاش تھی کہ میں اس کے بارہ میں ضروری تاریخی معلومات یہاں سے حاصل کروں۔

وقت کی تنگی کے باوجود، مجموعی طور پر میں نے اس کے لئے پورا ایک دن گزارا۔ گاڑی لے کر مالٹا کے مختلف حصوں میں سفر کرتا رہا۔ پبلک لائبریری۔ نیشنل لائبریری اور کئی دوسری لائبریریاں اور میوزیم دیکھے۔ مگر کہیں کسی ریکارڈ کا سراغ نہ ملا۔ یہاں کے نیشنل آرکائیوز میں ممکن ہے اس سلسلہ کا کوئی ریکارڈ موجود ہو۔ مگر اس کا علم مجھے آخر میں ہوا۔ اور وہاں جانے کا وقت میں نکال نہ سکا۔ البتہ ٹیلیفون پر ان کو تفصیلات درج کرا دی گئیں۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ تلاش کر کے بذریعہ ڈاک مطلع کریں گے۔

تاہم اس تمام دوڑ دھوپ اور تلاش کا ایک فائدہ ہوا۔ وہ یہ کہ اس مخصوص معاملہ سے متعلق اصل آدمی کا نام و پتہ معلوم ہو گیا۔ یہ مالٹا کے آرکائیوز کا انچارج تھا۔ اس سے ٹیلی فون پر بات کی گئی۔ اس نے کہا کہ ہمارے آرکائیوز میں برٹش دور کے بہت سے آثار ہیں۔ تاہم ان کی ترتیب ابھی باقاعدہ طور پر قائم نہیں ہو سکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ کا مطلوبہ ریکارڈ اس میں موجود ہو۔ مگر اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔ ذیل میں ان صاحب کا پتہ درج ہے کوئی صاحب چاہیں تو ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں:

Mr. J. Caruana, National Archives,
Santo Spirito, Rabat, Malta. Tel. 00-356-459863

ہم کو مالٹا کے اس خاص مکان کی تلاش تھی جہاں دونوں صاحبان کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ اس کے لئے کئی پرانی عمارتیں دیکھیں۔ جس عمارت کے بارہ میں بھی لوگوں نے گمان ظاہر کیا اس کو جا کر دیکھا۔ مگر عمارت کا سراغ نہ مل سکا۔ تاہم جہاں بھی ہم گئے وہاں کے لوگوں نے انتہائی ہمدردی اور تعاون کا انداز اختیار کیا۔

مولانا محمود حسن صاحب جامعہ ملیہ کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگر جامعہ ضروری وسائل فراہم

کرے اور اپنے کسی طالب علم کو کم از کم ایک مہینہ کے لئے یہاں بھیجے اور وہ تمام ممکن مقامات پر جا جا کر مکمل تحقیق کرے تو امید ہے کہ کچھ ریکارڈ حاصل ہو جائے گا۔

اس تلاش و تحقیق سے واپس آتے ہوئے ایک دکان پر نظر پڑی۔ اس کے بورڈ پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا: لے جائیے (Take away) آدمی اگر انھیں دو لفظوں کو سب کچھ سمجھ لے تو وہ گمان کرے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دکان میں داخل ہو اور جو چاہے وہاں سے بلا قیمت اٹھا لے جاؤ۔ مگر ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں۔ ان لکھے ہوئے لفظوں میں کچھ اور الفاظ اپنی طرف سے ملانے پڑیں گے اس کے بعد ہی ان کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔ مزید الفاظ کو ملانے کے بعد پوری بات یوں ہے: قیمت ادا کرو اور لے جاؤ۔

یہ الفاظ عام طور پر ان دکانوں پر ہوتے ہیں جہاں کھانے کا تیار سامان فروخت ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہوٹل نہیں ہے جہاں آپ بیٹھ کر کھائیں۔ البتہ یہاں سے کھانے کی چیزیں خرید کر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ ہر لفظ یا ہر عبارت اس وقت تک نامکمل ہے جب تک آپ اس میں اپنے حصہ کے ضروری الفاظ شامل نہ کریں۔

مالٹا میں ہماری معلومات کے مطابق، اس وقت دو مسجدیں ہیں۔ ایک قدیم مسجد ہے۔ یہ مسجد ترکوں کی بنائی ہوئی ہے۔ قدیم طرز کی کافی بڑی مسجد ہے۔ اس کو ہم صرف باہر سے دیکھ سکے۔ کیوں کہ وہ چاروں طرف سے بند تھی۔ غالباً وہ محکمۂ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ہے۔

دوسری مسجد نئی ہے۔ یہ لیبیا کے تحت تعمیر شدہ اسلامک سنٹر کی مسجد ہے۔ اس سنٹر میں بظاہر کوئی خاص سرگرمی نظر نہیں آئی۔ البتہ تعمیر کے اعتبار سے وہ کافی بڑا ہے۔ اور اس میں ایک نہایت خوبصورت مسجد ہے۔ اس مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ مسجد کے بیرونی دروازہ پر ایک عربی کتبہ لگا ہوا ہے اس پر یہ عربی الفاظ درج ہیں: بسم اللہ وعلی برکۃ اللہ: وضع الاخ العقید معمر القذافی حجر الاساس للمرکز الاسلامی بجمھوریۃ مالطا الصدیقۃ بتاریخ ۲۷ رجب ۱۳۹۸ھ ۲ یولیو ۱۹۷۸م

مالٹا سیاحوں کا شہر ہے۔ یہاں ہر روز کثرت سے ساری دنیا کے سیاح آتے رہتے ہیں۔ جس وقت ہم مذکورہ مرکز میں تھے، اس وقت بھی کچھ سیاح "اسلامک سنٹر" کو دیکھنے کے لئے آئے۔ اگر

اس مرکز کو حقیقی معنوں میں دعوتی مرکز کے طور پر چلایا جائے تو اس کے ذریعہ سے عظیم الشان فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مالٹا کے لیبی سنٹر میں چند افراد بطور کارکن ہیں۔ یہی اس سنٹر کی دنیا ہے۔ یہ لوگ مقامی سوسائٹی سے بالکل کٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے دو سیاح (ایک مرد، ایک عورت) سنٹر میں آئے۔ مگر وہاں ان لوگوں کو دینے کے لئے کوئی اسلامی لٹریچر موجود نہ تھا۔ چنانچہ انھیں گیٹ ہی سے رخصت کر دیا گیا۔ سنٹر کے مدیر نے شکایت کی کہ ہم کو مالٹا کی موجودہ کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا۔

ہم ابھی سنٹر میں تھے کہ ظہر کا وقت ہو گیا۔ لاؤڈ اسپیکر کے بغیر اذان دی گئی۔ فلسطین کے ایک سفید ریش بزرگ اپنے کمرہ سے نکلے۔ معلوم ہوا کہ وہ یہاں کے امام ہیں۔ امام سمیت سنٹر کے غالباً تین افراد جماعت میں شریک ہوئے۔ سنٹر کے یہی چند افراد اس مسجد کے نمازی ہیں۔ سنٹر کے مدیر نے گفتگو کے دوران ہنستے ہوئے کہا: نحن نؤذن فی مالطا (ہم مالٹا میں اذان دے رہے ہیں)

عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ فلان یؤذن فی مالطا یا فلان کمن یؤذن فی مالطا۔ اس مثل کا پس منظر یہ ہے کہ صلیبی جنگوں سے پہلے مالٹا میں مسلمان بڑی تعداد میں تھے۔ مگر صلیبی جنگوں کے دوران جب صلیبیوں نے مالٹا کو اپنا فوجی مرکز بنانا چاہا تو مسلمانوں کو یہاں سے ایک ایک کر کے نکال دیا۔ اس کے بعد مالٹا میں ایک بھی مسلمان باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد یہ مثل بنی کہ فلاں شخص تو مالٹا میں اذان دے رہا ہے۔ یعنی ایسی جگہ لوگوں کو پکار رہا ہے جہاں کوئی اس کی پکار کا جواب دینے والا نہیں۔

ماضی اور حال کا یہ فرق بے حد عجیب ہے۔ عقبہ بن نافع تابعی (۶۸۳ - ۶۲۱ء) افریقہ کو فتح کرتے ہوئے اپنی آخر عمر میں افریقہ کے ساحل تک پہنچ گئے جہاں اٹلانٹک کا وسیع سمندر ان کے سامنے موجیں مار رہا تھا۔ انھوں نے سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر کہا:

یارب لولا ھذا البحر لمضیت فی البلاد حتی لا یعبد احد دونک۔

اے میرے رب، اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں چل کر ملکوں میں پہنچ جاتا یہاں تک کہ تیرے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

یہ دور اول کے مسلمانوں کے جذبات تھے۔ وہ غیر عبادت گزار کو عبادت گزار بنانے کے

لئے تڑپتے تھے۔ اب ایک ہزار سال بعد جب اللہ نے راستے کھول دئے اور سفروں کو آسان کر دیا تو موجودہ مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ جہاں کوئی عبادت گزار نہ ہو وہاں آخر اذان دینے کی کیا ضرورت۔

۸ اکتوبر کی سہ پہر کو میڈیٹرینین کانفرنس سنٹر کے وسیع ہال میں کانفرنس کا افتتاح ہوا وزیر اعظم اٹلی، وزیر اعظم مالٹا، اور دوسرے لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ ایک مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ مذہب کا نیا نام امن ہے:

The new name of religion is peace

"امن" بذات خود تو مذہب کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ آج انسان ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جس کی تعلیمات پر امن زندگی کی طرف لے جانے والی ہوں۔

یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ پچھلے تلوار کے زمانہ میں جنگ کا تعلق صرف فوجی میدان سے ہوتا تھا۔ مگر اب جدید ہتھیاروں کے ظہور میں آنے کے بعد یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ جنگ کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود رہیں۔ آج جنگ کے معنی پوری انسانیت کی تباہی کے ہیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ "مسلح جد و جہد" کے ذریعہ اسلامی انقلاب لانے کی بات کرتے ہیں وہ بیک وقت دو نادانی کے شکار ہیں۔ وہ جدید انسان کو تشدد کا مذہب دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ آج کا انسان امن کے سوا کسی اور مذہب کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر بالفرض یہ حضرات وہ فوجی طاقت حاصل کر سکیں جس کے ذریعہ وہ موجودہ عالمی طاقتوں کو زیر کر کے زمین پر اسلامی اقتدار کا جھنڈا لہرائیں تو یہ ایک ایسی زمین ہوگی جہاں ان کے کارنامے کی داد دینے کے لئے کوئی انسان موجود نہ ہوگا۔ حتی کہ شاید وہ خود بھی نہ ہوں گے کہ اپنی انوکھی فتح اسلام کی تقریب مسرت منعقد کر سکیں۔

انٹرنیشنل کانفرنسوں کے عام رواج کے مطابق، یہاں بھی "ہیڈ فون" کا انتظام تھا۔ بولنے والا اپنی زبان (مثلاً فرانسیسی یا اطالوی) میں بولتا تھا۔ اور سننے والا آلۂ سماعت کے ذریعہ اس کو اپنی زبان (مثلاً انگریزی یا عربی) میں سنتا تھا۔ اس عمل کے دوران ایک بار مجھے خیال آیا کہ متکلم کی بات کو براہ راست طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ متکلم کی زبان کو سامع بھی سمجھتا ہو۔ متکلم اور سامع

دونوں کی زبان ایک نہ ہو تو کلام موجود ہوگا مگر سماعت وہاں پائی نہ جائے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ یہ سادہ طور پر صرف زبان کا معاملہ نہیں ہے بلکہ طرز فکر کا معاملہ بھی ہے۔ اگر متکلم کا طرز فکر ایک ہو اور سامع کا طرز فکر دوسرا ہو تو مشترک زبان کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے عاجز رہیں گے۔ مثلاً ایک شخص علمی تنقید کرے گا۔ مگر سننے والا اپنے مخصوص ذہنی سانچہ کی بنا پر سمجھے گا کہ وہ شخصی تنقیص کر رہا ہے۔ وغیرہ

مطبوعہ پروگرام کے مطابق، مالٹا کی کانفرنس میں مجھے تین بار عملی شرکت کا موقع ملا۔ ۸ اکتوبر کے اجتماع میں چیئرمین کی حیثیت سے۔ اس موقع پر میں نے کوئی باضابطہ تقریر نہیں کی۔ ابتداء میں میں نے چیئرمین کی حیثیت سے افتتاحی کلمات کہے۔ اس کے بعد دوسرے حضرات نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے۔ آخر میں میرے اختتامی کلمات پر جلسہ ختم ہوا۔

۹ اکتوبر کو صبح کی نشست خاص طور پر میری دلچسپی کی تھی۔ اس کا موضوع تھا اسلام اور عالمی چیلنج (Islam and the challenges of the world) اس موضوع پر میں نے اپنا انگریزی مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ ۹ اکتوبر کو آخری نشست میں لوگوں کے مقالات پر تبصرہ میرے ذمہ تھا۔ میں نے دوران کارروائی اپنا دو صفحہ کا تبصرہ انگریزی میں لکھا اور اس کو آخر میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

میرے مذکورہ مقالہ کے سلسلہ میں ایک عجیب بات پیش آئی۔ اس سلسلہ میں میں نے اپنی یادداشت کی ڈائری میں جو الفاظ لکھے تھے وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۹ اکتوبر کو دوبارہ میڈیٹیرینین کانفرنس سنٹر میں اجتماعات ہوئے۔ مختلف لوگوں نے اپنے اپنے مقالات پیش کئے۔ یہاں ۸۰ ملکوں کے لوگ آئے ہیں۔ اور ہر بڑے مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک اپنے اپنے خیالات پیش کر رہا ہے۔

آج میری تقریر کا موضوع تھا: اسلام اور جدید عالمی چیلنج۔ میں نے اس موقع کے لئے ایک مقالہ تیار کر کے پیشگی طور پر دہلی سے بھیج دیا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس کی کاپیاں بھی تیار کر لی تھیں۔ مگر مالٹا آنے کے بعد شرکاء کانفرنس سے جو باتیں ہوئیں اور لوگوں کے ذہن کا جو اندازہ ہوا، اس کے بعد میں نے چاہا کہ نئے پہلو سے میں اپنی بات یہاں پیش کروں۔

یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ کیوں کہ بہت کم وقت میں دوبارہ مجھے ایک نیا مقالہ تیار کرنا تھا۔ ۸ اکتوبر کی شام کو اس کے بارہ میں سوچتے ہوئے لیٹا اور سو گیا۔ رات کو حسب معمول ساڑھے تین بجے میری نیند کھل گئی۔ میں بستر سے اٹھا۔ وضو کر کے ہوٹل کے کمرہ میں دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد اپنی نئی تقریر لکھنے کے لئے میز پر بیٹھ گیا۔

آج صبح ۱۱ بجے کی نشست میں مجھے یہ مقالہ پیش کرنا تھا۔ میں نے تیزی سے اپنے خیالات جمع کئے اور ان کو کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ درمیان میں صرف فجر کی نماز کے لئے ایک بار اٹھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ سورج نکلتے نکلتے میرا مقالہ تیار ہو چکا تھا۔

اس کے بعد کمرہ کے ٹیلیفون کے ذریعہ کانفرنس کے منتظمین سے ربط قائم کیا۔ انھیں بتایا کہ میں نے اپنا مقالہ بدل دیا ہے۔ اور اب میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے نئے مسودہ کو ٹائپ کرانا ہے۔ انھوں نے مقالہ بدلنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ فوراً ہی انھوں نے اس کو حاصل کر کے ٹائپسٹ کے حوالے کر دیا۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ٹائپ کیا ہوا مقالہ میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ کانفرنس میں میں نے یہی دوسرا مقالہ پیش کیا۔

قاہرہ کے مفتی شیخ طنطاوی نے عربی میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں صرف دفاعی جنگ ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ نہیں ـــــ الاصل فی العلاقات السلام، القتال لایکون الا للمقاتلین، لایرجع المرء الی الحرب الا اذا کان مضطراً۔ وغیرہ

یروشلم سے بھی ایک ربی آئے تھے۔ انھوں نے یہودی مذہب کی ترجمانی کی۔ انھوں نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ فلسطین کی مقدس سرزمین لوگوں کے دلوں میں امن کا جذبہ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے:

The Holy Land is a source of inspiration for peace.

ربی کی تقریر سن کر مجھے خیال آیا کہ امتحان کی اس دنیا میں شاید الفاظ سب سے بڑا فتنہ ہیں۔ یہاں ہر بات خوبصورت لفظوں میں ڈھل جاتی ہے، خواہ باعتبار حقیقت وہ کتنا ہی بے اصل کیوں نہ ہو۔

۸ اکتوبر کو شام کا کھانا صدر مالٹا کے پیلس میں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا محل ہے جس کو غالباً انگریزوں نے بنایا تھا۔ ہم لوگ ایک بڑے ہال میں پہنچائے گئے۔ وہاں اعلیٰ تواضع کا انتظام تھا۔

کچھ دیر میں صدر مالٹا مسٹر تابون (Censu Tabone) ہال میں آئے اور لوگوں سے ملنے لگے۔ میں ہال کے کنارے کچھ لوگوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، ایک صاحب نے کہا کہ آپ بھی چلیں، پریسیڈنٹ سے مصافحہ کرلیں۔ مگر میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد خود پریسیڈنٹ صاحب میری طرف آئے اور سلام اور مصافحہ کیا۔ وہ ۱۹۸۹ سے مالٹا کے صدر ہیں۔

مذکورہ صدر میرے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ یہ صرف ان ملکوں کے عام رواج کی بات ہے کہ وہ اس طرح سادہ طور پر ہر ایک سے ملاقات کر رہے تھے۔ اسی قسم کا تجربہ مجھے مالٹا ایئرپورٹ پر بھی ہوا تھا۔ ہم لوگ ایئرپورٹ کے جس کمرہ میں بٹھائے گئے، وہاں پہلے سے مالٹا کے ایک وزیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم کو دیکھ کر وہ بلا تکلف فوراً اٹھ گئے اور کہا کہ آپ لوگ یہاں اطمینان سے بیٹھیں، میں دوسرے کمرہ میں چلا جاتا ہوں۔

کانفرنس کی تنظیمی ہیئت کے صدر پروفیسر ریکارڈی (Andrea Riccardi) ہیں۔ وہ اطالوی اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ ان سے ترجمان کی مدد سے گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کے مشن سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ مین آف ڈائیلاگ ہیں۔

اس جملہ میں دراصل یہ احساس چھپا ہوا تھا کہ مسلم علماء اکثر اس مزاج کے نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک عالم سے میری گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مسیحیوں کے ساتھ حوار میں داخل ہونا ہمارے لئے غیر مفید ہے۔ کیوں کہ اس حوار میں مسلمان کمزور فریق ہوتے ہیں جن کو قوی فریق استعمال کرتا ہے (المسلمون هم الطرف الضعيف يستخدمهم الطرف القوي)

اس کے مقابلہ میں مسیحی حضرات کا انداز زیادہ حوصلہ مندانہ تھا۔ مثلاً ایک عرب عالم نے ان عصری تحدیات (چیلنجز) کا ذکر کیا جو آج مسلمانوں کو درپیش ہیں۔ اس پر ایک مسیحی عالم نے کہا کہ یہ تحدیات صرف اسلامی تحدیات نہیں ہیں بلکہ وہ تمام ادیان کو درپیش ہیں (هذه التحديات ليست تحديات اسلامية فقط بل هي تحديات تواجهها كل الديانات) ایک مسیحی مقرر نے کہا کہ حضارت اسلامی کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مسیحیوں سے بھی ہے۔ حضارت اسلامی کو فروغ دینے میں مسیحی بھی مشترک ہیں۔ انھوں نے بھی اس کے لئے کام کیا ہے۔ البتہ ذہن ہمارا دوسرا ہے اور مسلمانوں کا دوسرا۔ یوحنا ابراہیم مسیحی عالم نے خالص عربی لہجہ میں تقریر

کرتے ہوئے یہ باتیں کہیں۔ یہ تقریر ۹ اکتوبر کو کانفرنس میں ہوئی۔

کانفرنس میں مسیحی حضرات ہم لوگوں کو السلام علیکم کے لفظ سے خطاب کرتے تھے اور انشاء اللہ وغیرہ الفاظ بے تکلف بولتے تھے۔ روم کے ایک مسیحی عالم سے میں نے پوچھا کہ انشاء اللہ کو اطالوی زبان میں کس طرح کہا جائے گا۔ انھوں نے فوراً ایک کاغذ پر لکھ کر دیا: SE DIO VUOLE

۱۰ اکتوبر کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ صبح کے سشن میں مختلف لوگوں کی تقریریں ہوئیں۔ ایک مقرر نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں ہر طرف تبدیلی کی بات کی جارہی ہے مگر عملاً تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص دنیا کو بدلنے کی بات کر رہا ہے، کوئی بھی شخص اپنے آپ کو بدلنے کے لئے نہیں سوچتا:

Everyone is thinking to change the world; no one is thinking to change himself.

حیفہ (اسرائیل) کے چیف ربائی نے اپنی تقریر میں امن کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ اس نے کہا کہ امن بھی خدا کا ایک نام ہے:

Peace is one of the names of God.

مگر اسی کے ساتھ جب اسرائیل کا ذکر آیا تو اس نے یہ بھی کہا کہ اس سے اس کی مراد صرف موجودہ اسرائیل نہیں ہے بلکہ وہ پورا علاقہ ہے جس کا خدا نے اسرائیل سے اس کی مقدس کتابوں کے مطابق وعدہ کیا ہے (Not the only Israel but all the promised land) دونوں باتوں میں واضح تضاد ہے۔ مگر جب آدمی کے اندر احتساب خویش کا مادہ نہ ہو تو اس کو اپنے نقائص کی خبر نہیں ہوتی۔

کانفرنس میں جو یہودی علماء اور مسیحی علماء آئے تھے، ان کو میں نے دیکھا کہ وہ بہت اچھی حالت میں ہیں۔ ان کی قوم نے ان کو نہایت اعلیٰ سہولتیں دے رکھی ہیں۔ ان کو اپنی قوم کے اندر عزت بھی حاصل ہے اور ہر قسم کے مادی وسائل بھی۔

میں نے سوچا کہ مذہبی اعتبار سے ہمارے یہاں مسجد کے امام اور مدرسہ کے مولوی کا جو درجہ ہے وہی یہودیوں کے یہاں ربی کا اور مسیحیوں کے یہاں پادری کا درجہ ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دوسروں کے یہاں، ان کی مذہبی شخصیت کو جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ مقام ہمارے یہاں کی مذہبی شخصیت کو حاصل نہیں۔

اس کی ایک وجہ کانفرنس کے تجربہ میں سمجھ میں آئی۔ میں نے دیکھا کہ یہودی اور مسیحی علماء نہایت اعلیٰ سطح پر اپنے مذہب کی نمائندگی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ عالمی زبانوں میں اپنے مذہب کی وکالت اس طرح کر رہے ہیں جس سے ان کے ہم قوم خوش ہو جائیں۔

یہی خصوصیت اگر مسجد کے امام اور مدرسہ کے مولوی کے اندر آجائے تو وہ بھی مسلمانوں کے اندر اونچا درجہ حاصل کر لے گا۔ مثلاً یہ لوگ اگر انگریزی سیکھ لیں اور مشترک اجتماعات میں انگریزی زبان میں اسلام کی اعلیٰ نمائندگی کرنے کے قابل ہو جائیں تو قوم کے اندر انھیں بھی اعلیٰ رتبہ حاصل ہو جائے گا۔

شام کی آخری کارروائی ساڑھے تین بجے شروع ہوئی۔ کانفرنس کے منتظمین اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک یہی پوری کانفرنس کا اصل خلاصہ ہوتا ہے۔

پہلے کار کے ذریعہ ہم کو ایک مقام پر پہنچایا گیا۔ یہاں قدیم انداز کا ایک بہت بڑا گیٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: باب البلد (Bieb il-Belt) گیٹ کے دوسری طرف سیدھی لمبی سڑک تھی۔ اس سڑک سے ہم کو گزرنا تھا۔ تقریباً ایک کیلومیٹر تک سڑک کے دونوں طرف بے شمار عورت اور مرد کھڑے ہوئے تھے۔ گیٹ پر پہنچتے ہی لوگوں نے خوش آمدید کے انداز میں تالیاں بجانی شروع کیا اور سارے راستے میں مسلسل بجاتے رہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میری زبان سے نکلا: کیسے عجیب خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کا استقبال جنت کے دروازہ پر کیا جائے۔

پروگرام کے مطابق ہر مذہب کے لوگوں کو مخصوص مقامات پر پہنچ کر اپنے اپنے انداز میں عبادت اور دعا کرنا تھا۔ چنانچہ مسیحی حضرات ایک چرچ میں داخل ہو گئے۔ ہم مسلمان تقریباً دس کی تعداد میں تھے۔ آگے پہنچے تو ایک بہت بڑے محل نما مکان کے صحن میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ یہاں بٹھا دیے گئے۔

یہاں نصیحت اور تذکیر کے انداز میں باتیں ہوئیں۔ سوڈان کے ایک عالم نے کہا کہ یہاں ہم کو اذان دینا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ صوفیاء نے اذان کے الفاظ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اللہ نے اس مقام پر تجلی فرمائی ہے اس لئے تم لوگ یہاں آؤ (ان اللہ سبحانہ وتعالیٰ تجلّٰی فی ھٰذا المکان فھلموا الیہ) اس کے بعد انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے مخصوص لہجہ میں اذان دی۔ تقریباً یقینی

ہے کہ اس محل میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ یہاں اذان کی آواز گونجی۔

یہاں ہم لوگوں نے شیخ طنطاوی کی امامت میں مغرب کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد سوال و جواب کے انداز میں دیر تک مجلس رہی۔ اس میں زیادہ تر دو آدمیوں نے حصہ لیا۔ ایک ایرانی عالم سوال کرتے رہے اور شیخ طنطاوی سنجیدہ علمی انداز میں ان کا جواب دیتے رہے۔ زیادہ تر سوالات "جہاد" کے مسئلے سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ طنطاوی کا نظریہ تھا کہ جہاد بمعنی قتال صرف دفاع کے لئے ہے۔ جب کہ ایرانی عالم کو اس سے اختلاف تھا۔

شروع سے آخر تک اس نشست میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ اس پوری مدت میں مسیحی حضرات بڑی تعداد میں ہمارے چاروں طرف ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ ہماری مجلس کی ساری کارروائی عربی زبان میں تھی۔ اس لئے وہ اس کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ تاہم مذہبی احترام کے جذبہ کے تحت وہ مسلسل خاموش کھڑے رہے۔ اسی طرح کھڑے ہو کر انھوں نے ہماری باجماعت نماز کو بھی دیکھا۔

یہ مسیحی حضرات جس انہماک اور عقیدت کے ساتھ ہماری نماز کو دیکھ رہے تھے اس کے بارہ میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ نماز باجماعت اپنی ذات میں ایک مکمل تبلیغ ہے۔ نمازی کے لئے وہ عبادت ہے اور دیکھنے والوں کے لئے دعوت۔

قرآن میں ہے کہ جن و انس کو صرف اللہ کی عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے (الذاریات ۵۶) عبادت کی سب سے اعلیٰ اور کامل صورت نماز ہے۔ غور کیجئے تو انسان کی نفسیات اور اس کا جسمانی ڈھانچہ اس طرح ہے گویا وہ نماز پڑھنے ہی کے لئے بنایا گیا ہو۔ ایسی حالت میں جب ایک غیر مسلم مسلمانوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھتا ہے، خاص طور پر جماعت کی نماز، تو اس کا پورا وجود خاموش طور پر کہہ اٹھتا ہے کہ یہی وہ چیز ہے جس کو میری فطرت مانگ رہی تھی۔ وہ نماز کو خود اپنی اندرونی طلب کا جواب سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح نماز کو دیکھنا اس کے لئے ایک عملی تبلیغ بن جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ بہت سے لوگ نماز کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے۔ ان کا وجود پہلے سے نماز جیسی ایک چیز کا طالب تھا۔ جیسے کوئی پیاسا آدمی پانی کا طالب ہو۔ جب انھوں نے نماز کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ یہ ان کے اپنے ہی اندرونی تقاضے کا خارجی مظاہرہ ہے۔ اس احساس کے تحت انھوں نے بڑھ کر اس کو اختیار کر لیا۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۲

انگریزی ہفتہ وار ایشیا ویک کے نمائندہ مسٹر روی ویلور نے ۱۴ مئی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اسلام کے شرعی قوانین کے موضوع پر تھا۔

۱ مئی ۱۹۹۲ کے تیسرے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے حیدر آباد اور گلبرگہ کا سفر کیا۔ اس سفر کی روداد سفر نامہ کے تحت انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۳ دہلی کے ہندی روز نامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ مسٹر جوہر عبداللہ نے ۱۳ مئی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو مسلمانوں کے مختلف ملی اور ملکی مسائل سے متعلق تھا۔

۴ انگریزی روز نامہ پانیر کے نمائندہ مسٹر کلدیپ کمار نے ۷ مئی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات زیادہ تر شریعت کا تصور اور موجودہ مسلمانوں کے مسائل سے متعلق تھے۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۱۰ مئی ۱۹۹۲ میں چھپا ہے۔

۵ مسلم تعلیمی انسٹی ٹیوٹ (راجوری) میں دسویں درجہ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ اس اسکول میں نویں اور دسویں درجہ کے طالب علموں کے لئے "اسلامی تعلیمات" کو کورس کی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔

۶ مالیر کوٹلہ سے گورمکھی زبان میں ایک پندرہ روزہ اخبار شمشیر دست کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے اڈیٹر جناب ساجد اسحاق ہیں۔ اس اخبار میں اکثر الرسالہ کے مضامین گورمکھی میں ترجمہ کر کے شامل کئے جاتے ہیں۔

۷ ایک صاحب لکھتے ہیں: روزہ نمبر (مارچ ۱۹۹۲) بہت زیادہ مفید ثابت ہوا۔ میں نے مسجد میں لوگوں کو باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ پڑھ کر سنایا۔ لوگوں کو مضامین بہت پسند آئے۔ لوگوں کے ذہنوں میں ایک انقلاب پیدا ہوا۔ اور اصلاح فکر میں کوشاں ہونے لگے۔ میں نے الرسالہ کے چھ خریدار بنائے ہیں۔ ان کے پتے لکھ رہا ہوں۔ ان سب کے نام الرسالہ جاری کر دیں (ڈاکٹر شاہ شاہد رشید صابری، سہارن پور)

۸ ایک صاحب خیر جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے، انھوں نے اپنی طرف سے مکمل زر تعاون ادا کر کے ایک سو افراد کے نام الرسالہ ایک ایک سال کے لئے جاری کرایا ہے۔ اس

ہیں اردو، ہندی، انگریزی تینوں زبان کے رسالے شامل ہیں۔

۹ مولانا اے ندوی (درنگ) نے "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ترجمہ آسامی زبان میں کرکے کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ رضاالدین احمد صاحب (درنگ) نے بتایا کہ اس ترجمہ کو عام طور پر پسند کیا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو صرف ایک کتاب ہے۔ اب آپ اس سلسلہ کی تمام کتابوں کو اور تذکیر القرآن کو بھی آسامی زبان میں ترجمہ کرکے چھاپیں۔

۱۰ محمد امتیاز احمد صاحب (پیدائش ۱۹۶۳) بہار شریف (نالندہ) کے رہنے والے ہیں۔ وہ عرصہ سے الرسالہ کے قاری ہیں۔ اب ان کے اندر جذبہ پیدا ہوا کہ کچھ کام کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے یہاں دینی کتابوں کی دکان کھول لی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے الرسالہ کی ایجنسی بھی لے لی ہے اور الرسالہ مطبوعات بھی اپنے یہاں رکھ رہے ہیں۔

۱۱ آئینہ راعین ایک ہفت روزہ پرچہ ہے جو مراد آباد سے نکلتا ہے۔ اس کے صفحات میں اکثر الرسالہ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح بہت سے پرچے حوالہ یا حوالہ کے بغیر الرسالہ کے مضامین شائع کر رہے ہیں۔

۱۲ مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی نے بتایا کہ بڈیڈ (ضلع گوڑگاؤں) کی مسجد میں وہ ہر روز نماز فجر کے بعد کچھ نصیحت کی بات کرتے ہیں۔ آجکل وہ روزانہ "الربانیہ" کے ایک صفحہ کا مضمون نمازیوں کو بتاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ مسجدوں میں الرسالہ کے مضامین یا کتابوں کے ذریعہ لوگوں کی ذہنی تربیت کر رہے ہیں۔

۱۳ مسز حسن (سمستی پور) لکھتی ہیں: الرسالہ ہم کو بہت پسند ہے۔ اس کی کچھ کاپیاں ہم اپنے رشتہ داروں کے ذریعہ انگلینڈ بھیج رہے ہیں تاکہ وہاں وہ اپنے احباب میں تقسیم کریں۔ الرسالہ یقیناً وہاں بھی مقبول ہوگا۔ کیوں کہ اس کی سادہ اور صاف تحریر سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ الرسالہ حقیقت تک پہنچنے کا سیدھا، آسان اور پرکشش راستہ بتاتا ہے وہ لوگوں کی کردار سازی میں مدد دیتا ہے۔ وہ حق کی پہچان کراتا ہے اور انسانوں کا بھلا چاہتا ہے۔ میں نے ہندی الرسالہ بھی ایک غیر مسلم پڑوسی کو دیا ہے۔

۱۴ جب میں نے الرسالہ کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں پایا کہ قرآن وحدیث، دنیا و آخرت کی حقیقتیں سبق آموز واقعات اور با اصول زندگی گزارنے کے بہترین نسخے۔ اور وہ سب کچھ جو ہر انسانی زندگی کے لئے درکار ہے۔ میں الرسالہ کا ایسا متوالا بن گیا ہوں کہ ہر مہینے اس کا بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ جنوری ۱۹۹۰ کا واقعہ ہے کہ میں اپنے یہاں کے مولانا امیر حسن صاحب کے بک اسٹال (حسن بک سنٹر) پر کھڑا تھا۔ وہاں میں نے الرسالہ دیکھا، لے کر پڑھنے لگا، کچھ ہی صفحات پڑھا تھا کہ میرے دل کی دنیا بدل گئی۔ الرسالہ نے میرے دل و دماغ پر زبردست اثر ڈالا۔ میں نے اسی دن یہ تہیہ کر لیا کہ الرسالہ کو ہمیشہ اپنی زندگی سے وابستہ رکھوں گا۔ میں خدا کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میری توجہ اس تعمیری رسالہ کی طرف ایسے وقت میں ڈال دیا جو کہ میرے مزاج کے بننے اور بگڑنے کا زمانہ تھا۔ چنانچہ دو سال کے متواتر مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ الرسالہ نے میرے مزاج کی اصلاح کیا۔ اور میرے اندر صحیح سوچ پیدا کیا" الرسالہ کا مقام دنیا میں اٹھنے والی تمام اسلامی تحریکوں میں ایسا ہے جیسا کہ دنیا کو روشن کرنے میں سورج کا مقام" (محمد عابد حسین، چمپارن)

۱۵ ایک کتاب "ہندستانی مسلمان" تیار ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ الرسالہ میں آئندہ بطور نمبر شائع کی جائے گی۔

ایک صاحب لکھتے ہیں: الرسالہ کے مطالعہ سے صحیح راہ کو پہچان سکا ہوں۔ تعمیری اور غیر تعمیری قدم میں فرق محسوس کرنے لگا ہوں۔ صرف یہ ہی نہیں، جذباتیت اور سطحیت سے بالا ہو کر مقصدیت کو ترجیح دینے لگا ہوں۔ کاش ملت اسلامیہ اس پیغام کی اہمیت کو پہچان سکے۔ (سعید احمد سندیلوی، اردو اکیڈمی، لکھنؤ)

ضرورت رشتہ

ایک دیندار، پٹھان خاندان کی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (MBBS) فائنل ایر کی طالبہ کے لیے رشتہ مطلوب ہے۔ ڈاکٹر کو ترجیح دی جائے گی۔ الرسالہ کے پتہ پر خط وکتابت فرمائیں۔

اجتماع

پچھلے اعلان کے مطابق، یہ طے کیا گیا ہے کہ کل ہند بنیاد پر ایک عام اجتماع کیا جائے۔ یہ اجتماع انشاء اللہ ۲۲-۲۳-۲۴ اکتوبر ۹۲ ۱۹ کو ہندستان کے تاریخی شہر بھوپال میں ہوگا۔ اس اجتماع میں اسلامی مرکز اور الرسالہ مشن سے اتفاق رکھنے والے علماء، مدارس عربیہ اور غیر عربیہ کے فارغین اور عام اہل علم وفکر حضرات شرکت کریں گے۔

اجتماع کی کارروائی انشاء اللہ ۲۲ اکتوبر، جمعرات کی شام کو شروع ہوگی اور ۲۴ اکتوبر سنیچر کی دوپہر تک ختم ہو جائے گی۔

اس سلسلہ میں انفرادی دعوت نامے جاری نہیں کیے جا رہے ہیں۔ جو لوگ الرسالہ مشن سے اتفاق رکھتے ہیں وہ اسی اعلان کو کافی سمجھیں اور مقررہ وقت پر بھوپال پہنچنے کی کوشش کریں۔

مزید تفصیلات (متعین مقام، پتہ اور پروگرام وغیرہ) انشاء اللہ آئندہ ماہ الرسالہ میں شائع کر دی جائیں گی۔

منیجر الرسالہ

C-29, Nizamuddin West, New Delhi-110 013, Tel 611128, 697333

حیدرآباد میں اسلامی مرکز کی کتابیں اور الرسالہ
کے لیے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں :

الرسالہ بک سنٹر اینڈ فری بک لائبریری
نمبر ۱۰ یوسف بازار (فرسٹ فلور) نزد ٹیکسی اسٹینڈ چادرگھاٹ۔ حیدرآباد
(اوقات : صبح ۱۰ تا ۱۲، شام ۴ تا ۷)

ـ	
قرآن جلد اول	175/-
قرآن جلد دوم	175/-
نبـر	45/-
کاب	40/-
ب اور جدید چیلنج	
ت قرآن	30/-
ت اسلام	6/-
ت صحابہ	6/-
ال	50/-
سلام	40/-
اسلام	40/-
زندگی	25/-
اسلام	20/-
یات	60/-
مستقیم	40/-
اسلام	45/-
م اور اسلام	40/-
ا اور عصر حاضر	30/-
سیہ	40/-
ان ملت	45/-
نتِ حج	30/-
ی تعلیمات	25/-
م دورِ جدید کا خالق	25/-
یثِ رسولؐ	35/-
ری جلد اول	80/-
ری جلد دوم	80/-
رنامہ (ملکی اسفار)	80/-
رنامہ (غیر ملکی اسفار)	80/-
کا سفر	35/-
ادت نامہ	20/-
اہ عمل	25/-
بیر کی غلطی	50/-
ین کی سیاسی تعبیر	20/-
قوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیاتِ اسلام	6/-
تعدد ازواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	
صداقتِ اسلام	
علماء اور دورِ جدید	
ہندستانی مسلمان	
سیرتِ رسولؐ	
عربی	
الاسلام یتحدی	
سقوط الماركسية	
حقيقة الحج	

آڈیو کیسٹ

A-1	حقیقتِ ایمان	25/-
A-2	حقیقتِ نماز	25/-
A-3	حقیقتِ روزہ	25/-
A-4	حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5	حقیقتِ حج	25/-
A-6	سنتِ رسولؐ	25/-
A-7	میدانِ عمل	25/-
A-8	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9	اسلامی دعوت کے جدید امکانات	25/-
A-10	اسلامی اخلاق	25/-
A-11	اتحادِ ملت	25/-
A-12	تعمیرِ ملت	25/-
A-13	نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

V-1	پیغمبر انقلاب
V-2	اسلام داعی امن
V-3	اسلام دورِ جدید کا خالق
V-4	امت مسلمہ کے لیے نئے چیلنج
V-5	اسلام اور سماجی انصاف
V-6	اسلام اور دورِ حاضر

God Arises	75/-
Muhammad The Prophet of Revolution	75/-
Islam As It Is	
God Oriented Life	
Words of the Prophet	40/-
Introducing Islam	
Religion and Science	
Tabligh Movement	20/-
Islam the Voice of Human Nature	20/-
Islam the Creator of Modern Age	50/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Man Know Thyself!	4/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Social Justice in Islam	6/-
Polygamy in Islam	3/-
Words of Wisdom	

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

1976-77 سال	90/-
1978	80/-
1979	80/-
1980	80/-
1981	80/-
1982	80/-
1983	80/-
1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984	80/-
1985	80/-
1986	80/-
1987	80/-
1988	80/-
1989	80/-
1990	80/-
1991	80/-

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

1990-91	85/-

الرسالہ بک سنٹر

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

- قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
- عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
- خواتین اور بچوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
- پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
- قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
- اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
- اسلامی مجلات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
- زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
- اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون: ۶۹۷۳۳۳، ۶۱۱۱۲۸

Single Copy Rs. 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25